ورلڈ کرسچن بکس نمبر ۱۴

یسوع مسیح کون ہے؟

مصنفہ

سٹیفن نیل

مترجمہ

وائی۔ کے۔ آثم۔ ایم۔ ٹی۔ ایچ

پنجاب ریلیجس بک سوسائٹی

انارکلی۔ لاہور

بار اوّل ۱۹۵۹ء تعداد ۱۰۰۰

فہرست ابواب

نمبر شمار — صفحہ

تجربہ سے اصول

مسیحی ایمان زندگی میں ہمیشہ بصورت تجربہ شروع ہوتا ہے۔ اور ازاں
بعد لازماً اصول یا عقیدہ ظاہر ہوتا ہے۔ ایمان کا یہ حال شروع ہی سے رہا ہے۔
مسیحی کلیسیا کی کہانی ناصرت کے نجار یسوع سے شروع ہوتی ہے۔ اُس نے لوگوں
کو اپنے پاس بُلایا۔ وہ اُس کے ساتھ رہے۔ اُس کے کاموں کو دیکھا۔ اُس کی
باتیں سُنیں اور اُس کے دوست بن گئے۔ اُس نے اُنہیں اپنے پیامبر بنا کر
بھیجا جب وہ پیغام سنا چکے تو وہ اُس کے پاس لوٹ آئے۔ ایمان کے
تجربہ میں اُسوقت بھی جبکہ مسیح خود اُن کے ساتھ تھا وہ اُس کے متعلق کئی
ایک سوالات پوچھنے سے باز نہ رہ سکے اور حقیقت یہ ہے کہ مسیح خود ہی
اُنہیں سوال پوچھنے اور جواب طلب کرنے کی جرأت دلاتا تھا۔ اُن تمام جواب
طلب سوالات میں سے زیادہ اہم سوال یہ تھا کہ کیا حقیقتاً یسوع ہی عہد
عتیق کے نوشتوں کا موعود ممسوح خادم خدا کا مسیح ہے۔ بعض اوقات تو وہ
خیال کرتے تھے کہ ہاں وہی مسیح موعود ہے۔ اور بعض دفعہ انہیں کافی یقین نہ ہوتا۔
جب وہ اُن سے جُدا ہو گیا تو اُنہیں اپنے سوالات از سرِ نو دہرانے اور کئی

ایک نئے سوال پوچھنے پڑے جو پیشتر ازیں اُنہیں نہ سُوجھے تھے۔ مثلاً ایسے سوال کہ اُنہیں اُس سے ایسا لگاؤ کیوں ہے جو پہلے کبھی کسی سے نہ ہُوا تھا؟ یہ کیا معاملہ ہے کہ وہ اپنے درمیان اُس کی موجُودگی کو محسُوس کرتے اور پہچانتے ہیں حالانکہ اُسے دیکھ نہیں سکتے؟ یہ شخص کون ہو سکتا ہے جس کی قُدرت اب اُن پر زیادہ مسلط ہے بہ نسبت اُس وقت کے جبکہ وُہ گلیل اور یہودیہ میں زندہ اُن کے ساتھ تھا؟ رسُول اور دیگر ایماندار اُن سوالات کے کئی مُختلف جوابات دیتے تھے، جن میں سے بعض استعارے تھے۔ مثلاً "خُدا کا برّہ"، "عمارت کے کونے کے سرے کا پتھر"، "صُبح کا چمکدار ستارہ"۔ بعض جواب سادہ لیکن موزُوں تھے۔ مثلاً "خُداوند"، "مسیح"، "خُدا کا بیٹا"۔ ان ہی اور ان جیسے دیگر محاورات سے اصُول کا آغاز ہُوا۔ ان بامعنی الفاظ میں سے بعض کا مطالعہ ہم اِس کتاب کے آئندہ اوراق میں کریں گے۔

جُوں جُوں وقت گُزرتا گیا، کلیسیا نے محسُوس کیا کہ لازم ہے کہ ہم صاف صاف بیان کریں کہ یسُوع کے متعلق ہم کیا مانتے ہیں چنانچہ مؤخرالذکر محاورات نے عقیدہ کی صُورت اختیار کرلی۔ عقیدے کا اوّلین استعمال یہ تھا کہ اُس کے وسیلہ سے بپتسمہ کے وقت نئے مسیحی اپنے ایمان کا اقرار کرتے تھے۔ ایسے عقائد میں اُن ضروری حقائق کو مرتب کیا گیا تھا جو ایک نئے مسیحی کو کلیسیا میں شریک ہونے اور ایمانداروں کی جماعت میں شمولیت حاصل کرنے سے پہلے سیکھنا ضروری ہیں۔ یہ عقائد بپتسمہ کے اُمیدواروں کے معلّموں کے لئے رہنما ہُوا کرتے تھے، تاکہ کوئی ضرُوری بات تعلیم میں سے اوجھل نہ رہ جائے۔ یہ عقائد اُن علاقوں میں آج بھی یہی مقصد پُورا کرتے ہیں جہاں نئے شرکاء کلیسیا میں شامل کئے جا رہے ہیں۔ نئے ایمانداروں کے لئے صرف بپتسمہ کا عقیدہ سیکھنا

ہی گکتی نہ تھا لیکن چونکہ یہ عقیدہ مختصر اور حفظ کرنے کے لئے آسان تھا لہٰذا
اسے ذہن نشین کرنے سے اُنہیں ایمان کی مرکزی حقیقتیں ہمیشہ یاد رہتیں جن
کے مطابق اُنہیں آئندہ زندگی گزارنی ہوتی۔ ابتدائی عقائد بیشتر حقائق کے
بیانات پر مشتمل ہوتے تھے۔ ایسے اُمور کا بیان جو واقع ہو چکے تھے، ایسے
کاموں کا بیان جو خُدا نے کئے تھے مثلاً یہ کہ خُدا نے جہان کو بنایا۔ یسُوع پیدا
ہُوا۔ مُوا اور پھر جی اُٹھا چنانچہ ہم ایسے مختصر بیانات اس عقیدہ میں دیکھتے
ہیں جسے اکثر رسُولی عقیدہ کہا جاتا ہے۔

لیکن عقائد محض اسی غرض سے مرتب نہیں کئے گئے تھے، جیسا کہ ہم
یُوحنّا کے پہلے خط میں دیکھتے ہیں (۱ یُوحنّا ۲: ۲۲-۲۸، ۴: ۱-۶) ابتدا
ہی سے کلیسیا کو ایسے معلّمین سے واسطہ پڑتا رہا جو غلط تعلیم سکھاتے
تھے چنانچہ خطرہ لاحق ہُوا کہ صحیح ایمان جو رسُولوں نے سکھایا تھا غلط باتوں
کی آمیزش سے موڑ توڑ کر کچھ اور ہی نہ بنا دیا جائے۔ پس کلیسیا کے لئے ضروری
تھا کہ صریح اور تحقیق بیانات کے ذریعے سچائی کو ایسا ظاہر کریں کہ بطالت اُس
میں گڈمڈ نہ ہو سکے۔ رسُولوں کے عقیدہ میں بھی یہ جملہ "جس نے آسمان اور
زمین کو بنایا" غالباً اسی لئے شامل کیا گیا تھا کیونکہ بعض لوگ یہ تعلیم دیتے تھے
کہ دُنیا اور اس کے تمام معائب کا خالق۔ واحد برحق اور ابدی خُدا باپ نہیں
بلکہ کوئی کمتر دیوتا ہے۔ جُوں جُوں غلط تعلیمات سے مقابلہ جاری رہا عقائد بھی
طویل اور زیادہ مفصل ہوتے گئے۔ رسُولوں کے عقیدہ کے بعد ابتدائی کلیسیا
کے مشہور ترین عقائد نائیسیئن عقیدہ اور ایتھانیسئیس کا عقیدہ کہلاتے ہیں۔
(یہ عقائد اینگلیکن دُعائے عام میں مندرج ہیں) لیکن ان کے علاوہ اور بھی کئی
عقیدے تھے جو کلیسیا میں مستعمل تھے یا تھوڑی دیر مستعمل رہ کر متروک ہو گئے۔

کیونکہ اُن کی جگہ دیگر زیادہ مبیّن عقائد نے لے لی۔ جو لوگ عقائد مرتب کرتے تھے اُنہیں کوئی نئی چیز پیش کرنا مطلوب نہ ہوتا بلکہ صرف یہ کہ امورِ ایمان کو زیادہ صحت کے ساتھ واضح کیا جائے۔ لہٰذا ایسا کرنے میں اُنہیں بائبل کے الفاظ کے علاوہ اُس زمانہ کے یُونانی فلسفہ کی اصطلاحات بھی استعمال کرنے کی ضرورت پڑی اور اُن میں سے بعض اصطلاحات ایسی ہیں جنہیں ایک عام آدمی نہیں سمجھ سکتا۔

آجکل بھی اُن جگہوں میں جہاں جنوبی ہندوستان کی مانند مختلف کلیسیائیں متحد ہو رہی ہیں، ضرورت محسوس ہوتی ہے کہ وُہ اپنے ایمان کا ایسا بیان مرتب کریں جس سے یہ ظاہر ہو کہ اُن کے موجودہ اور سابقہ اظہار الایمان میں کیا فرق ہے اور دیگر کلیسیاؤں سے اُن کا عقیدہ کن باتوں میں فرق ہے۔ اور شائد اس لئے بھی کہ وُہ گرد و نواح کے غیر مسیحی ایمان اور اپنے مسیحی ایمان میں نمایاں فرق ظاہر کر سکیں۔ ایسے تاویلی بیانات عموماً عقائد سے زیادہ طویل و مفصّل ہوتے ہیں۔

یہ کوئی تعجّب کی بات نہیں کہ جب عام مسیحی ان تشریحی دستاویزوں کو دیکھتے ہیں تو متعجّب ہوتے ہیں کہ اُن کا مطلب کیسے سمجھا جائے اور مایُوس ہوتے ہیں کہ اُن غیر مسیحیوں کو ان کے مطالب کیسے سمجھائے جائیں، جو یہ جاننا چاہتے ہیں کہ مسیحی ایمان کس سے متعلّق ہے۔ چنانچہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ کیا یہ سب دقتیں ضروری ہیں۔ کیا یہ بہتر نہ ہوگا کہ آسان و سادہ باتیں استعمال کی جائیں، اور مسیحیوں کو یسوع مسیح پر سادہ سے ایمان میں زندگی گزارنے دی جائے؟ اِن احساسات سے ہمدردی تو یقیناً پیدا ہوتی ہے، لیکن کیا یہ دقتیں آسانی سے دُور کی جاسکتی ہیں۔ اور کیا ہم سب یسوع مسیح پر سادہ ایمان رکھنے کے معنی پر متفق ہیں؟۔

ایک مسیحی تو خوب سمجھتا ہے کہ یسُوع خدا کا بیٹا ہے۔ وُہی خود خُدا ہے جو آدمیوں کے درمیان کام کرتا ہے۔ سوائے مسیح کے متعلّق دیگر سوالات بہت

اہم معلوم نہیں ہوتے۔ ایک ایسا شخص جو عرصۂ دراز تک اپنی زندگی میں گناہ
اور کمزوری کا مقابلہ کرتا رہا ہو اور پھر زندہ مسیح سے دوچار ہو جائے اور محسوس
کرے کہ اُس نے گناہ کی طاقت سے رہائی پالی ہے تو وُہ جانتا ہے کہ صرف خدا
ہی نے اُسے یہ مخلصی بخشی ہے۔ اگر سادہ لوح لوگوں کا کوئی قبیلہ ہمیشہ بدرُوحوں
کا ڈر مانتا رہا ہو، جنگلوں اور پہاڑوں کی بدرُوحوں، بیماری اور تباہی کی بدرُوحوں کا
یقین رکھتا ہو اور اُنہیں مسیح کی پہچان حاصل ہو جائے تو بدرُوحوں کا زور اُن پر سے
جاتا رہے گا۔ بدرُوحوں کا وجُود تو بدستُور رہتا ہے لیکن مسیحی جانتے ہیں کہ جب تک
وُہ اِس قلمرو میں ہیں جہاں مسیح ہے تو کوئی بدرُوح اُنہیں چھُو بھی نہیں سکتی لیکن
نادیدنی دُنیا کی نیکی اور بدی کی خوفناک جنگ میں سوائے اس کے جو خُود خُدا تھا،
اور کون فاتح ہو سکتا ہے۔

بعض مسیحی یا متلاشی بات کو اور طرح سے سمجھتے ہیں۔ موجُودہ زمانہ میں ہزاروں غیر
مسیحی اناجیل کا مطالعہ کر رہے ہیں۔ ہندوستان میں مہاتما گاندھی نے مسیح کی زندگی میں
جو نمایاں دلچسپی لی ہے اس سے اور بیشمار ہندو نئے عہدنامہ کو پڑھنے لگ گئے
ہیں۔ انگریزی بولنے والے ممالک میں اناجیل کے نئے نئے تراجم تیار ہو گئے ہیں۔ مثلاً
ڈاکٹر ای۔ وی۔ ریو (DR. E. V. RIEU) کا ترجمہ جو سلسلۂ پیلیکن کُتب
(PELICAN BOOKS) میں شائع ہُوا ہے، ایسے تراجم اُن لوگوں میں جو
کلیسیا سے بہت کم یا قطعی تعلّق نہیں رکھتے بہت مقبُول ہوتے ہیں۔ ایسے لوگ
جو باہر سے ایسی کُتب کے ذریعے مسیح کی کہانی سے واقفیت حاصل کر لیتے ہیں
اُن کا رویّہ اکثر یہ ہوتا ہے کہ وُہ مسیحیوں سے کہتے ہیں "ہم مانتے ہیں کہ یہ ایک
بڑی ہستی کی مؤثر اور دلکش کہانی ہے جو کہ ایک بڑا اُستاد اور نامور جوانمرد تھا۔
لیکن یہ تو بتائیں کہ آپ مسیح کو ایک دیوتا بنانے کی کوشش میں سادہ سی کہانی کو

کیوں غلط ملط کر دیتے ہیں۔ آپ ہمارے لئے یسوع ناصری کی سادہ انسانی کہانی کو کیوں شگفتگی نہیں رہنے دیتے؟

اِس موضوع پر بحث و مباحثہ کرنے والے دوستوں سے الوہیتِ مسیح کے متعلق دو فریق پیدا ہو گئے ہیں۔ ایک وُہ جو سادگی سے مسیح کو خُدا مان لیتے ہیں دُوسرے وُہ جنہیں اُسے خُدا تسلیم کرنے میں دِقت محسوس ہوتی ہے (مُترجم) ہم شاید یہ کہہ سکتے ہیں کہ حقیقت میں یہ معاملہ ایسا سادہ نہیں جیسا کہ ہمیں شروع شروع میں معلوم ہوتا ہے۔

نسلِ انسانی گناہگار ہے وُہ اپنے آپ کو گُناہ سے ہرگز آزاد نہیں کر سکتی تاوقتیکہ خُدا خُود گُناہ کے بندھن توڑ کر اُسے آزاد نہ کرے۔ لیکن کیا انسان کسی خارجی چیز کے وسیلہ گُناہ سے رہائی حاصل کر سکتا ہے؟ کیا ضروری نہیں کہ یہ بڑی تبدیلی اُس کے باطن میں بھی آجائے؟ مقدس پولُس اس مسئلہ کو بڑی صفائی سے ہمارے سامنے یُوں پیش کرتا ہے "پس جب آدمی کے سبب سے موت آئی تو آدمی ہی کے سبب سے مُردوں کی قیامت بھی آئی"۔ (کرنتھی ۱۵ : ۲۱) کیا خُدا کا بیٹا سچ مچ آدمیوں کو بچا سکتا ہے، جب تک کہ وُہ خود پُورے اور کامل طور سے اور ہر لحاظ سے انسان نہ ہو؟ کیا مسیح ہمارا مُنجی ہو سکتا ہے تاوقتیکہ وُہ پہلے ہمارا بھائی نہ ہو؟ بعض لوگ سمجھتے ہیں کہ بھائی کہنے میں مسیح کی توہین ہے لیکن بعینہ یہی لفظ نئے عہد نامہ میں استعمال ہُوا ہے "وُہ اُنہیں بھائی کہنے سے نہیں شرماتا چنانچہ وُہ فرماتا ہے کہ تیرا نام مَیں اپنے بھائیوں سے بیان کروں گا"۔ (عبرانیوں ۲ : ۱۱-۱۲)

اس کے برعکس وُہ لوگ جو مسیح کو محض ایک نیک انسان ماننا شروع کرتے ہیں بالآخر محسُوس کرتے ہیں کہ اُنہیں اپنا خیال تبدیل کرنا ہوگا۔ شاگردوں

نے بھی اوّل اوّل تو مسیح کو تمام انسانوں سے معظّم و محترم جانا اور بعد میں اُس کی پرستش کرنے لگ گئے۔ اور ہم بجا طور سے کسی شخص کی پرستش کیسے کر سکتے ہیں جو کہ خدا نہ ہو۔ وُہ اُن کے لئے صرف انیس سَو ۱۹۰۰ برس پہلے کی تواریخی شخصیت ہی نہیں بلکہ ایک ایسا دوست ہے جو آج بھی زندہ ہے۔ اور جس کے ساتھ وُہ بات چیت کرنا مرغوب محسُوس کرتے ہیں۔ اور یہ کون ہے جو حالانکہ مر گیا پھر بھی زندہ ہے۔ کیا سوا مسیح کے اور بھی کوئی شخص ایسا ہے جسکے متعلق ہم یہ کہہ سکتے ہیں ؟

القصّہ یہ معاملہ کچھ ایسا معمولی نہیں۔ شائد ہم اس کے صرف ایک ہی پہلو پر غور کرنے اور دُوسرے پہلو کو نظر انداز کرنے سے اُسے ایک معمُولی اور سادہ بات بنا سکتے ہیں اور ان سارے مسائل کو جو اس مسئلہ سے متعلّق ہیں پس پُشت ڈال سکتے ہیں۔ اور اگر ہم دیانتداری سے تمام حقائق کو تسلیم کریں، تو یقیناً مسیح پر ایمان لانا اور اُس کے وسیلہ سے نجات پانا ایک سادہ سی بات ہو گی۔ کیونکہ دُنیا میں اکثریت سادہ لوگوں کی ہے۔ اور خدا کی ظاہر کردہ مرضی بھی یہی ہے "وُہ چاہتا ہے کہ سب آدمی نجات پائیں۔ اور حق کی پہچان تک پہنچیں"۔ (۱ تیمتھیس ۲: ۴)

لیکن دُنیا میں اور بے شمار چیزیں ایسی ہیں جو بظاہر سادہ اور معمُولی معلوم ہوتی ہیں لیکن جب ہم اُن کی گہرائیوں میں اُترتے ہیں تو یکے بعد دیگرے پیچیدگی ہی پیچیدگی نظر آتی ہے۔ مثلاً کھانا پینا کتنی معمُولی سی بات ہے۔ ہم کھاتے ہیں اور پیتے ہیں اور زندہ رہتے ہیں۔ ہمارا کھانا پینا ہمارے جسم کا حِصّہ بن جاتا ہے جو ہمارے بدن کو تقویت دیتا ہے۔ لیکن پیٹ میں ہماری خوراک پر کیا گزرتی ہے ؟ بہت کم لوگ جانتے ہیں کہ ہمارا جسم کیسے کام کرتا ہے۔ اور حقیقت یہ ہے کہ جب ہمارا جسم باصحت کام کرتا ہے تو ہمیں کبھی خیال بھی نہیں ہوتا۔ لیکن اگر ہم

سائنسدانوں کی معلومات پر غور کریں تو ہم اس پیچیدہ مشین کو جو ہمارے اندر کام کرتی ہے، دیکھ کر اور اُن اعمال کو معلوم کر کے جو ہمارے علم کے بغیر ہر لمحہ ہمارے اندر جاری ہیں دنگ رہ جائیں گے۔ گذشتہ تین صدیوں کی تمام معلومات کے باوجود سائنسدان معترف ہیں کہ ابھی اور بہت سی باتیں ہیں جن کے متعلق انہیں کچھ علم نہیں اور بہت سی پیچیدگیاں ہنوز ایسی ہیں جنہیں وہ نہیں سلجھا سکے تو پھر کوئی تعجب نہیں اگر ہمیں ایمان کو سمجھنے میں بھی پیچیدگیوں سے دوچار ہونا پڑے اور کہ اپنے مطالعہ کے اختتام پر ہمیں یہ ماننا پڑے کہ بہت سی باتیں ایسی ہیں جو ہمارے اذہان پورے طور سے سمجھنے سے قاصر ہیں۔

جب ہم ان مختلف طریقوں پر غور کرتے ہیں جن سے عہد جدید کے مصنفین کوشش کرتے ہیں کہ مسیح کے بارے میں اپنے خیالات کا اظہار کریں اور واضح کریں کہ وہ کون ہے تو ہم خداوند کے اور زیادہ نزدیک کھنچ جاتے ہیں۔ مسیح خداوند نے خود شاگردوں سے یہ سوال پوچھا "تم مجھے کیا کہتے ہو؟" (متی ۱۶: ۱۵)۔ اگر ہم سنجیدگی سے یہ مطالعہ کریں اور یسوع اور اُس کے احباب کے الفاظ پر صبر سے غور کریں تو یقیناً ہم اُسے بہتر طور پر سمجھنے لگ جائیں گے۔ ہمیں معلوم ہونے لگے گا کہ بہت سی باتیں جو مسیح کے بارے میں عام کہی جاتی ہیں اُن میں سے بعض ایسی ہیں جنہیں کہنا قرینِ مصلحت ہے۔ کیونکہ وہ عہدِ جدید کی گواہی کے مطابق نہیں۔ اور ہمیں توقع ہے کہ اس مطالعہ سے ہمارے کئی سوالات کے جوابات مل جائیں گے۔ اور بعض ایسے سوالات کے لئے جن کے جواب ہم پورے طور سے نہیں دے سکتے ہیں مفید اشارات ملیں گے۔ اس مطالعہ سے ہمیں مسیح کی گواہی دینے اور مسیحیوں اور غیر مسیحیوں کے سوالات کے جواب دینے میں کافی مدد ملے گی؛ جو ان دنوں مسیح کے بارے میں پوچھے جاتے ہیں۔ کیونکہ عہدِ جدید کے

مصنفین نے اپنی کتب گواہی کے طور پر ہی لکھیں یسوع مسیح کی طرف سے انہیں گواہی دینے کا کام سونپا گیا تھا۔ (اعمال ۱:۸) ہم اُن کے جانشین ہیں اور اب ہماری باری ہے کہ گواہی کے کام میں اپنا حصہ ادا کریں۔ کلیسیا کا فرض اولین ہے کہ اس گواہی کو جاری رکھے جب تک کہ ہر قوم اور اُمّت خوشخبری نہ سن لے اور دُنیا کا آخر نہ ہو۔

دُوسرا باب

اناجیل میں مسیح

ہمارے پاس چار انجیلیں ہیں۔ اِن میں سے ہر ایک اپنے ایک خاص نکتہ نظر سے لکھی گئی ہے۔ اِن چاروں کی تفصیلات میں کافی فرق ہے، لیکن ایک بات پر سب کی سب متفق الرائے ہیں، کہ ہر انجیل ایک کامل انسان کی داستان ہے، جو فی الحقیقت ایک خاص مقام اور ایک خاص وقت پر آدمیوں کے درمیان آدمی بن کر رہا۔ اس کا ثبوت عہدِ جدید کے علاوہ دیگر تواریخی کتب سے بھی ملتا ہے۔ دو انجیل نویس متّی (۱:۱-۱۷) اور لوقا (۳:۲۳-۳۸) مسیح کے نسب نامہ کو کئی پشتوں تک پیچھے لے جاتے ہیں۔ اور ان دو نسب ناموں میں کئی ایک اختلافات ہیں جنکی وجہ بیان کرنا مشکل ہے

ہے (یوحنا ۱: ۴۲) "یسوع نے اُس پر نگاہ کر کے کہا کہ تو یوحنا کا بیٹا شمعون ہے۔ تو کیفا یعنی پطرس کہلائے گا" یعنی چٹان " ایسا وقوت ایک خوبی ہے جو تمام عظیم المرتبت انسانوں میں پائی جاتی ہے۔ اور مسیح میں یہ خوبی تمام آدمیوں سے جو آجتک پیدا ہوئے ہیں کہیں بڑھ چڑھ کر تھی۔ یہودی اُسے ایک عالم وفاضل نہیں سمجھتے تھے۔ (یوحنا ۷: ۱۵) "پس یہودیوں نے تعجب کر کے کہا کہ اس کو بغیر پڑھے کیونکر علم آگیا؟" تاہم وہ پاک نوشتوں کی تشریح و تفسیر یہودی عُلما سے کہیں بہتر کر سکتا تھا کیونکہ اُس نے تصور اور روحانی ہمدردی کے جذبہ سے سرشار ہو کر اُن نوشتوں کو سیکھا تھا، جیسا کہ اُس نے دوبارہ اُن نوشتوں کو فریسیوں کے سامنے اقتباس کیا۔ (متی ۹: ۱۳، ۱۲: ۷) اُس نے ایک چھوٹی سی آیت میں عہدِ عتیق کے مکاشفہ کے مطابق خُدا کی پاک خصلت کا نچوڑ یوں پیش کیا! "کیونکہ میں قربانی نہیں بلکہ رحم پسند کرتا ہوں۔" (ہوسیع ۶: ۶)

معلوم ہوتا ہے کہ مسیح کو بھی حقائق کا علم تحصیل علم کے عام طریقے سے ہوتا تھا۔ اُس نے سچائی کی تعلیم دی لیکن اُس نے کبھی بھی سائنس اور تاریخ کے موضوعات پر کوئی مکاشفہ پیش نہ کیا۔ کیونکہ اُس کا مقصد ایسے علوم سکھانا نہیں تھا۔ ان حقیقتوں کو معلوم کرنا اُس نے انسانوں کے ہاتھوں میں رہنے دیا تاکہ وہ خود اُن کی تحقیق کریں۔ تعلیم دیتے وقت اُس نے انسانی زندگی کی نہایت سادہ باتوں اور واقعات کو استعمال کیا۔ مثلاً بیج بونا فصل کاٹنا، شادی، جنازے، بے انصاف قاضی اور فرمانبردار بیٹے۔ اُس نے کبھی کسی صورت سے یہ ظاہر نہ کیا کہ وہ کوئی ایسی بات جانتا ہے جو اُس کے زمانہ میں فلسطین کا کوئی شخص نہ جانتا ہو۔ یا عہدِ عتیق میں سے نہ سیکھ سکتا ہو۔ ہمارے لئے مسیح کے بہت کم الفاظ اُسی زبان میں لکھے گئے ہیں، جس میں اُس نے کلام کیا تھا سوائے اس اقتباس کے جو زیر

۲۲ : ۱ سے مرقس ۱۵ : ۳۴ میں کیا گیا ہے جو کہ قریباً عبرانی ہے، باقی تمام الفاظ آرامی (ARAMAIC) زبان میں ہیں۔ جو زباندانی کے لحاظ سے عبرانی کے بہت قریب تھی۔ اور مسیح کے ایام میں فلسطین میں عام بولی جاتی تھی۔ "تلتا قومی" (مرقس ۵ : ۴۱) افتح (مرقس ۷ : ۳۴) ان کے علاوہ اور بھی چند ایسے الفاظ ہیں۔ بہت ممکن ہے کہ مسیح کچھ یونانی اور شاید کچھ لاطینی جانتا تھا۔ کیونکہ یہ زبانیں بھی ملک فلسطین میں عام طور پر بولی جاتی تھیں۔ کلام مقدس میں کہیں بھی کوئی اشارہ نہیں کہ مسیح بغیر سیکھے دیگر زبانیں بول سکتا تھا۔

بعض دفعہ ہم دیکھتے ہیں کہ مسیح بڑے سادہ سوال پوچھتا ہے۔ مثلاً جیسا کہ اس نے شاگردوں سے کہا "تمہارے پاس کتنی روٹیاں ہیں جاؤ دیکھو" (مرقس ۶ : ۳۸) انجیل کے الفاظ میں کوئی ایسا اشارہ نہیں پایا جاتا جس سے ثابت ہو کہ وہ ایسے سوالات کے جوابات جانتا تھا۔ اور حقیقتاً وہ میری اور آپ کی طرح آگاہی چاہتا تھا۔ اُسے عام انسانوں کی طرح اطلاع کی ضرورت پڑتی تھی اور ایک موضوع پر مسیح صاف الفاظ میں اپنی لاعلمی کا اقرار کرتا ہے۔ "لیکن اُس دن اور اُس گھڑی کی بابت کوئی نہیں جانتا نہ آسمان کے فرشتے۔ نہ بیٹا۔ مگر صرف باپ" (متی ۲۴ : ۳۶)

یہ بھی صاف ظاہر ہے کہ مسیح میں بڑی زبردست اور خاص الخاص توفیقیں بھی تھیں۔ اور تھوڑی دیر کے بعد ہم اُس کے معجزات کا ذکر کریں گے۔ لیکن آیئے ہم اُن کاموں پر بڑی احتیاط سے غور کریں جو مسیح نے عمداً نہ کیے۔ یعنی یہ کہ اُس نے کبھی کوئی غیر معمولی کام محض اپنی طاقت کی نمود کے لئے نہ کیا جیسا کہ شعبدہ باز اکثر کرتے ہیں۔ اس بات کی توضیح میں ہم اپوکرفا (APOCRYPHA) میں سے مسیح کی ایک کہانی پیش کرتے ہیں، جو اُن کہانیوں میں سے ایک ہے جن میں شاید حقیقت تو کم ہے لیکن عقیدت اور تفنن کی بنا پر افسانہ ساز مسیحیوں نے تحریر کر رکھی ہیں۔ کہانی یہ

ہے کہ جب مسیح بچہ ہی تھا تو بچوں کے ساتھ کھیل رہا تھا سارے بچے مٹی سے پرندے بنانے لگے۔ مسیح نے بھی پرندے بنائے تو اُس کے پرندوں نے پر پھڑپھڑائے اور ہوا میں اُڑ گئے۔ لیکن اناجیل میں ایسی کوئی بات بھی نہیں ملتی۔ ہم کہیں نہیں دیکھتے کہ وہ اُڑ کر آن کی آن میں ایک جگہ سے دوسری جگہ چلا گیا۔ لیکن ہمیشہ دوسرے انسانوں کی مانند پیدل چلتا یا کشتی پر سفر کرتا تھا۔ وہ کبھی بیک وقت دو جگہوں میں موجود نہ ہوتا تھا۔ جیسا کہ بعض جادوگروں کے حق میں مانا جاتا ہے۔ اُس نے اپنی اعلےٰ طاقتوں کو اپنے شخصی مفاد کے لئے کبھی استعمال نہ کیا۔ بعض لوگ یوحنا ۸: ۵۹ کے یہ الفاظ "مگر یسوع چھپ کر ہیکل سے نکل گیا" پڑھ کر یہ نتیجہ اخذ کرتے ہیں کہ مسیح غائب ہو گیا تھا۔ لیکن یہ خیال انجیل میں مذکور نہیں اور نہ ہی غالباً اس آیت کے یہ معنی ہو سکتے ہیں۔ بلکہ جب اُس کا دُکھ اُٹھانے کا وقت آیا تو اُس نے بلا مقابلہ اپنے آپ کو دُشمن کے حوالہ کر دیا۔

مسیح کے انسانی پہلو پر، سب سے بڑھکر یہ کہا جا سکتا ہے کہ مسیح دُوسرے مردوں اور عورتوں کے ساتھ اپنے تعلّقات میں عین انسان ثابت ہوتا ہے۔ وہ اُنہیں پسند کرتا ہے اور اُن کی صحبت سے لُطف اُٹھاتا ہے۔ اُس نے خُود تو ویرانے میں روزہ رکھا لیکن اپنے تبلیغی زمانہ میں نہ تو خُود روزہ رکھا اور نہ شاگردوں کو روزہ رکھنے کا حکم دیا۔ (مرقس ۲: ۱۸ - ۲۰) اُس کا قانائے گلیل میں شادی کے موقع پر حاضر ہونا ایک قدرتی سی بات نظر آتی ہے۔ (یوحنا ۲: ۱-۱۱) اُس کا شمعُون فریسی کے گھر دعوت پر جانا (لُوقا ۷: ۳۶-۵۰) بھی اسی طرح ایک قُدرتی چیز ہے۔ وہ سب سے محبت رکھتا تھا لیکن بعض اُس کے خاص دلی دوست تھے۔ لعزر کی بہنیں اُس مشفقانہ تعلقات کی بناء پر جانتی تھیں کہ وہ یسوع کو بُلا کر بتا سکتی ہیں کہ "جسے تُو عزیز رکھتا ہے وہ بیمار ہے۔" اور انجیل نویس اس امر کی

ان الفاظ میں تصدیق کرتا ہے "اور یسوع مارتھا اور اُس کی بہن اور لعزر سے محبت رکھتا تھا"۔ (یوحنا ۱۱: ۳ و ۵) یہ دوستی یکطرفہ نہ تھی بلکہ مسیح اُن سے اور وُہ مسیح سے محبت رکھتے تھے۔ گو بلاشبہ مسیح اپنے دوستوں کو زیادہ فائدہ پہنچاتا اور خود اُن سے کم فائدہ اُٹھاتا تھا، تاہم وُہ اُن کی محبت کی قدر ضرور کرتا اور اُن کی وفاداری پر بھروسہ رکھتا تھا۔ زمینی زندگی کی آخری رات وُہ نہایت خوش تھا کہ اُس کے دوست اُس کے ساتھ ہیں۔ اور اُس نے اُن کی وفاداری کی داد دی۔ "مگر تم وُہ ہو جو میری آزمائشوں میں برابر میرے ساتھ رہے"۔ (لوقا ۲۲: ۲۸) اُس نے اپنے تین چنیدہ شاگردوں کو اپنی تکلیفوں میں جہاں تک ہو سکا حصّہ دیا اور جب جاگنے کی بجائے اُن کو سوتے پایا تو افسردہ اور رنجیدہ ہُوا (مرقس ۱۴: ۳۷ - ۴۲) اگر یہ ساری باتیں اتنی صحت اور حیرت انگیز طریق سے سچ ہیں اور اگر مسیح ایسا پُورا اور مکمل انسان ہے، تو پھر ہمارے دلوں میں یہ سوال اُٹھتا ہے کہ یہ کیونکر ہُوا کہ لوگوں نے اُسے فوق الانسان سمجھنا شروع کر دیا؟ وُہ تو ایک ایسا شخص تھا جسے اُنہوں نے اپنی آنکھوں سے دیکھا اور ہاتھوں سے چھُوا تھا۔ (۱ یوحنا ۱: ۱-۲)، اُنہوں نے کیوں اُس کے متعلق یہ کہا کہ وُہ انسان ہے۔ اور پھر یہ بھی کہ وُہ نہ صرف انسان ہے۔ بلکہ انسان سے بڑھ کر ہے۔

آیئے ہم ان دو دلائل کو جو اکثر پیش کی جاتی ہیں، مگر درست معلوم نہیں ہوتیں نظر انداز کرتے ہُوئے مندرجہ بالا سوال کا جواب تلاش کریں۔

بعض لوگ سمجھیں گے کہ ہم اس سوال کا جواب مسیح کی پیدائش کی اُس کہانی میں تلاش کریں گے جو متی ۱: ۱۸ - ۲۵ اور لوقا کے پہلے دو ابواب میں مرقوم ہے۔ وہاں لکھا ہے کہ مسیح کنواری سے پیدا ہُوا اور اُس کی پیدائش انسانی باپ کے اصُول تناسل کے بغیر فوق الفطرت طریق سے ہُوئی۔ کہا جاتا ہے

کہ چونکہ مسیحیوں نے یہ سیکھ رکھا تھا کہ مسیح کنواری سے پیدا ہوا اس لئے وہ اُسے خدا کا بیٹا سمجھنے لگے۔ لیکن یہ خیال نئے عہد نامہ کی تعلیم کے مطابق نہیں۔ مرقس کی انجیل میں کنواری سے پیدا ہونے کا قطعاً ذکر نہیں۔ اور یوحنا کی انجیل میں (۸: ۴۱) صرف ایک اشارہ سا ہے۔ پولس کی تحریرات میں شائد ایک یا دو مخفی سے اشارے ہیں (گلتی ۴: ۴) اس سے زیادہ کنواری سے پیدا ہونے کے متعلق اور کچھ نہیں۔ اعمال کی کتاب میں شاگردوں نے یہ ثابت کرنے کے لئے کہ مسیح خدا کا بیٹا ہے، کنواری سے پیدا ہونے کو کہیں بھی بطور دلیل پیش نہیں کیا۔ حقیقت تو یہ ہے کہ دلیل اُس کے برعکس کام کرتی ہے۔ اگر ہم یہ مانتے ہیں کہ مسیح خدا کا بیٹا ہے تو پھر یہ سوچنا معقول ہے کہ مسیح ایک خاص طریقہ سے اس دُنیا میں آیا۔ اگر خدا کا مقصد یہ تھا کہ وہ یہ ظاہر کرے کہ وہ مسیح کو پرانی نسل آدم میں سے ایک نیا مخلوق پیدا کر رہا ہے تو کیا مسیح کے کنواری سے پیدا ہونے کے طریقہ سے بڑھکر اس مقصد کو ظاہر کرنے کے لئے کوئی اور طریقہ ہو سکتا تھا؟

دیگر لوگوں نے اِس بات پر بڑا زور دیا ہے کہ مسیح کی الٰہی فطرت کے ثبوت میں اُس کے معجزات ایک بڑی شہادت ہے۔ خدا کے بیٹے کے سوا کون ایسے حیرت انگیز کام کر سکتا ہے۔ لیکن ایسا معلوم ہوتا ہے کہ مسیح نے خود کبھی بھی اس طریق سے استدلال نہیں کیا تھا۔ اُس نے شاید اس قسم کے ایمان کی کبھی داد نہیں دی جو محض معجزات ہی پر مبنی ہو (یوحنا ۴: ۴۸ و ۶: ۲۶)۔ وہ لوگ بھی جنہوں نے معجزات کو دیکھا اس طرح استدلال نہیں کرتے تھے۔ اور اُن کا معجزات سے استدلال نہ کرنا معقول بھی تھا۔ وہ عہدِ عتیق سے واقف تھے۔ لہٰذا وہ انبیاء اور بالخصوص ایلیاہ اور الیشع کے معجزات کو خوب جانتے تھے۔ پہلے اور دوسرے سلاطین کی کُتب میں مسیح کے تقریباً سارے معجزات جیسے معجزات پائے جاتے

ہیں۔ مثلاً کوڑھی کا پاک صاف ہونا (۲ سلاطین ۵ باب) بھیڑ کو کھلانا (۲ سلاطین ۴ : ۴۲-۴۴) مردے کو زندہ کرنا (۱ سلاطین ۱۷ : ۱۷-۲۴ : ۲ سلاطین ۴ : ۱-۳۷) وغیرہ وغیرہ۔ ایلیاہ یا الیشع کے بارے میں کبھی کسی نے یہ خیال نہ کیا کہ وہ خدا کا بیٹا تھا۔ چنانچہ جب مسیح نے اُن بڑے بڑے کاموں کو کرنا شروع کیا تو قدرتی طور پر لوگ کہنے لگے کہ "ایک بڑا نبی ہم میں برپا ہوا ہے" اور "خدا نے اپنی اُمت کی طرف توجہ کی ہے" (لوقا ۷ : ۱۶) اور جب مسیح نے سوال کیا کہ "لوگ ابن آدم کو کیا کہتے ہیں" تو شاگردوں نے بھی یہی جواب دیا "بعض یوحنا بپتسمہ دینے والا۔ بعض ایلیاہ۔ بعض یرمیاہ یا نبیوں میں سے کوئی" (متی ۱۶ : ۱۳-۱۴) اور پطرس ان سب باتوں کو مدِنظر رکھکر یہ نہیں کہتا کہ چونکہ تو خدا کا بیٹا ہے اُس سے یہ کام کرتا ہے۔ بلکہ وہ یوں کہتا ہے "وہ بھلائی کرتا اور اُن سب کو جو ابلیس کے ہاتھ سے ظلم اُٹھاتے تھے شفا دیتا پھرا کیونکہ خدا اُس کے ساتھ تھا" (اعمال ۱۰ : ۳۸)

آیئے ہم اپنے سوال کا جواب کسی اور جگہ سے تلاش کریں۔ پہلا اشارہ جس کی رہنمائی میں آگے بڑھنا چاہیئے مسیح کی بے گناہی ہے فرمایا ہے "تم میں سے کون مجھ پر گناہ ثابت کرسکتا ہے" (یوحنا ۸ : ۴۶) اور ایسا عظیم المرتبہ شخص جو انا جیل میں عین سچ بولنے کے سوا کبھی کچھ نہیں کہتا ایسا دعویٰ نہ کرسکتا تھا جب تک کہ اُسے کامل یقین نہ ہوتا کہ اُس کے دشمن کوئی گناہ اُس کے خلاف نامزد نہیں کر سکتے۔ اُس کے مقدمہ کے وقت جبکہ اُس کے دشمن اُس پر الزامات لگانے کی پوری پوری کوشش کر رہے تھے۔ صرف یہ الزام اُس کے خلاف کھڑا کرسکے کہ اُس نے کہا ہے کہ میں اِس مقدس کو ڈھاؤنگا اور کہ اُس نے خدا کا بیٹا ہونے کا دعویٰ کیا ہے۔ (مرقس ۱۴ : ۵۶-۵۹ و ۶۱-۶۳) اگر وہ خدا کا بیٹا نہ

ہوتا تو یقیناً ایسا کہنا کفر ہوتا لیکن اگر وہ بیٹا تھا تو پھر یہی وہ سوال ہے جس پہ ہم غور وخوض کر رہے ہیں۔

لیکن تفصیلاً یہ ثابت کرنے کے لئے کہ وہ بے گناہ ہے ہمیں اُس کے کاموں اور اُس کی باتوں پر بلکہ اُس کے تمام خیالات پر بھی تفصیلاً غور کرنا ہوگا۔کیونکہ صحیح معنوں میں خیالاً بھی گناہ کیا جا سکتا ہے گو عملاً وہ کبھی ظاہر نہ ہو۔ چنانچہ اس سے یہ خیال پیدا ہوتا ہے کہ مسیح کی خوبیٔ معصومیت کے اظہار کے لئے لفظ بے گناہ موزوں نہیں۔ بے گناہی نفی ہے۔ اور محض گناہ کی عدم موجودگی کو ظاہر کرتی ہے۔ مگر ہم کچھ مثبتی طور پہ ظاہر کرنا چاہتے ہیں۔ ہمیں ایک ایسی صفت کا اظہار مقصود ہے جس میں صحت۔ کمال اور قدرت شامل ہیں۔ اور جو یقیناً مسیح میں موجود تھی اور یہ صاف ظاہر ہے کہ جس کسی کو مسیح سے واسطہ پڑا اُس پر مسیح کی یہ صفت اثر انداز ہوئی۔ زندگی کی حالت پہ وہ غالب آتا تھا۔ دیگر لوگ بعض حالات میں کشمکش و پنج میں پڑ جاتے ہیں کہ کیا کریں اور کیا نہ کریں لیکن مسیح ہمیشہ یقینی طور پہ جانتا تھا کہ وہ کہاں سے آیا اور کدھر کو جاتا ہے۔ اکثر اوقات اُسے کسی کام کے کرنے کے لئے موزوں وقت تک ٹھہرنا پڑتا تھا (یوحنا ۲ : ۴ و ۱۳ : ۱) لیکن جب اُس کا وقت آجاتا تو وہ بڑے تیقن سے اپنا کام سرانجام دیتا تھا۔ اور وہ خوب جانتا تھا کہ اُسے کیا کرنا ہے۔ یہاں تک کہ صلیب پر بھی اُس کی نگاہوں میں یہ بات اہم نہیں تھی کہ لوگ اُس سے کیا سلوک کر رہے ہیں بلکہ وہ فتح اہم ہے جو وہ اُن کی ایذا میں حاصل کر رہا ہے۔ اور وہ انداز اہم ہے جس میں وہ ایذا برداشت کر رہا ہے۔

مسیح کا خُدا کے ساتھ وہ رشتہ نہیں جو عام انسانوں کا ہوتا ہے۔ ہم اپنے گناہوں کے سبب بلاخوف خُدا کے پاس نہیں جا سکتے۔ جتنا کوئی آدمی زیادہ مقدس ہوگا اُتنا ہی زیادہ اپنی نالائقیت اور ناپاکی کو محسوس کرے گا۔ مسیح بہترین انسان تھا تاہم اُس

میں کسی ایسے احساس کا نام تک بھی نہیں۔ وُہ دُوسرے لوگوں کو توبہ کرنے اور گناہوں کی معافی مانگنے کی تلقین کرتا ہے۔ لیکن خُود کبھی توبہ کرنے اور خُدا سے گناہوں کی معافی مانگنے کی ضرُورت محسوس نہیں کرتا۔

اس کا کیا سبب ہے؟ ہم تو سب اس بات میں یکساں ہیں کہ ہم نے خطا کی ہے اور چُونکہ خُدا پاک ہے اس لئے ہمیں کوئی حق نہیں کہ خُدا کے سامنے ٹھہر سکیں۔ اور یہ نہ صرف ہمارے ہی حق میں بجا ہے بلکہ تمام بنی نوع انسان کے حق میں سچ ہے اور اگر یہ مسیح کے حق سچ نہیں تو پھر وُہ جو بہت سی باتوں میں ہم جیسا ہے سب سے اہم بات میں ہم سے فرق ہے اور یہ فرق تشریح طلب ہے۔

دُوسری بات جس کے سبب سے مسیح کے دوست اُس کی اُلوہیت کے قائل ہوئے اُس کی قیامت یعنی اُس کا مرُدوں میں سے جی اُٹھنا ہے۔ جیسا کہ مقدس پولُس رسُول لکھتا ہے "لیکن پاکیزگی کی رُوح کے اعتبار سے مرُدوں میں سے جی اُٹھنے کے سبب قدرت کے ساتھ خُدا کا بیٹا ٹھہرا۔ (رُومی ۱: ۴) شاگرد قیامتِ مسیح کی معرفت معانی کو فوراً نہ سمجھ سکے وُہ اتنا جانتے تھے کہ اُن کا آسمانی دوست جی اُٹھا ہے۔ اور زندہ ہے۔ اور کہ خُدا نے اُس کی شکست کو فتح میں تبدیل کر دیا ہے رفتہ رفتہ انہیں معلُوم ہو گیا کہ اُن کا یہ زندہ دوست ہر جگہ اور ہر وقت اُن کے ساتھ ہے۔ جب وُہ عبادت کے لئے جمع ہوتے تو وُہ وہاں ہوتا جب وُہ مسیح کے بارے میں سوچتے تو محسوس کرتے کہ وُہ خُدا کے بارے میں سوچتے ہیں۔ جب خُدا کے بارے میں سوچتے تو محسوس کرتے کہ مسیح کے بارے میں سوچ رہے ہیں۔ اُسی کے نام میں وُہ دُعا مانگتے اور شاید براہِ راست اُسی سے دُعا مانگتے۔ یقیناً استفنس اپنی موت کے وقت یُوں چلّایا "اَے خُداوند یسُوع میری رُوح کو قبول کر" (اعمال ۷: ۵۹)

علاوہ ازیں شاگردوں کو یقین ہو گیا تھا کہ جو کچھ مسیح نے زمین پر کیا تھا وُہ اُس

کے کام کا محض آغاز ہی تھا اور کہ وُہ ہنوز کام کر رہا ہے۔ اور جو کام اُس نے شروع کر رکھا ہے، اُس کی تکمیل کے لئے پھر آئے گا۔ اور ضرور ہے کہ وُہ آسمان میں رہے جبتک کہ سب چیزیں بحال نہ کی جائیں (اعمال ۳ : ۲۱) اور یقیناً وُہ وقت آئے گا۔

پس مسیح کے شاگرد اُسے جلالی معنوں میں ماننے لگے۔

۱۔ پہلے پہل لوگ صلیب کے جلال سے اثر پذیر ہوئے۔ وُہ چیز جو بے عزتی کی شکست معلوم ہوتی تھی اب خُدا کی محبت اور قدرت کا عظیم الشان مظہر نظر آنے لگی (فلپی ۲ : ۸-۱۱)

۲۔ پھر زمانہ حال میں لوگ رُوح کے جلال سے اثر پذیر ہوئے۔ پاک رُوح جی اُٹھے ہوئے مسیح کا تحفہ تھا اور پاک رُوح کی قدرت میں کلیسیا کے وسیلے مسیح اپنا وُہ کام جاری رکھتا ہے جو اُس نے زمین پر شروع کیا تھا۔ (۲ کرنتھیوں ۳ : ۱۸)

۳۔ اور آخر کار مستقبل میں تکمیلِ زندگی کا جلال ظاہر ہو گا، جبکہ ہمارے عقیدہ کے مطابق "وُہ جلال کے ساتھ پھر آئیگا زندوں اور مُردوں کا انصاف کرنے کو"۔ (یُوحنّا ۱۷ : ۲۴)

شاگردوں کے ایّام سے لیکر آجتک کلیسیا کا یہی ایمان رہا ہے۔ لیکن ابھی تک بہت سے ایسے سوالات ہیں جن کے جواب مطلوب ہیں۔ یہ یسُوع کون ہے جس نے زمین پر خدا کو ظاہر کیا اور "اب خُدا کے دہنے ہاتھ بیٹھا ہے" جو ہر جگہ اپنی کلیسیا میں موجود ہے جس نے پاک رُوح بخشا ہے یعنی اپنا رُوح اور جو دُنیا میں خُدا کے سارے مقاصد کی تکمیل کرنے پھر آئے گا؟ مقدّس یُوحنّا کی انجیل میں ہم یُوں پڑھتے ہیں کہ یسُوع یہ جان کر کہ باپ نے سب چیزیں میرے ہاتھ میں کر دیں اور میں خدا کے پاس سے آیا اور خُدا ہی کے پاس جاتا ہوں"۔ (یُوحنّا ۱۳ : ۳) اس

اقتباس کا کیا مطلب ہے ؟ کبھی نہ کبھی ہر ایک مسیحی اس سوال سے دوچار ہوتا ہے۔ اگر ہم گذشتہ تواریخ پر نگاہ ڈالیں تو معلوم ہوتا ہے کہ مسیح نے ایمانداروں کی ہر پشت سے مخاطب ہو کر یہی سوال پوچھا ہے "تم مجھے کیا کہتے ہو" اور اس سوال کا جواب ڈھونڈتے وقت ہم نئے عہدنامہ۔ رسُولوں اور کلیسیا کی مدد سے استفادہ کریں گے۔ لیکن بالآخر یہ سوال ہم میں سے ہر ایک کے سامنے شخصی طور پر آتا ہے۔ "میرا ایمان کیا ہے" ؟ اور شائد جو جواب ہم دیں آخر کار ہم اُسی کے مطابق پرکھے جائیں۔

تیسرا باب

مسیح کے دعاوی

اگر مسیح فی الحقیقت خُدا یا خُدا کا بیٹا تھا تو اُس نے ہمیں صاف صاف دلیری کے ساتھ کیوں نہ بتا دیا تاکہ معاملہ ہمیشہ کے لئے طے ہو جاتا ؟ یہی وہ سوال ہے جو مسیحیوں سے اکثر پُوچھا جاتا ہے۔ اور وہ لوگ پُوچھتے ہیں جو مسیح کو خُدا اور انسان نہیں مانتے لیکن معلوم ہوتا ہے۔ کہ ایسے سائل مسیح کے طریقۂ تعلیم کو نہیں سمجھتے۔

اگر آپ کے پاس کوئی آدمی آئے اور کہے کہ "میں دُنیا میں دورِ حاضرہ کا

بہترین واعظ ہوں؟ تو آپ پر اس بات کا کیا اثر ہوگا؟ لمحہ بھر کی حیرانی کے بعد آپ شاید کہیں گے یہ اچھی بات ہے کہ آپ بہترین واعظ ہیں۔ مگر آپ کو اس بات کا کیونکر علم ہے اور آپ کے پاس اس دعوے کا کیا ثبوت ہے؟ بہت سے دعاوی ایسے ہوتے ہیں جنہیں ہم محض مدعی کے کہنے ہی سے تسلیم نہیں کر لیتے۔ ہم کہتے ہیں چلیے ہم آپ کے کچھ وعظ سنیں اور ہم اُن کا دیگر مبلغین کی تقاریر سے موازنہ کریں۔ پھر شاید ہم فیصلہ کر سکیں گے کہ آپ کا دعویٰ درست ہے یا غلط۔ کیا مسیح کے دعاوی کا بھی بعینہ یہی حال نہیں؟ ہر چند وہ ہمیں صاف صاف الفاظ میں کہہ بھی دیتا کہ میں خدا کا بیٹا ہوں پھر بھی ہم ثبوت مانگتے ہیں اور وہ اپنے الفاظ افعال اور کردار کے علاوہ اور کیا اثبات پیش کر سکتا تھا؟

مزید براں ہم دیکھتے ہیں کہ مسیح کا طریقۂ تعلیم ہمیشہ یہ تھا کہ وہ دوسروں سے سوال کیا کرتا اور جو باتیں لوگ خود بخود معلوم اور دریافت کر سکتے تھے وہ کبھی نہیں بتاتا تھا۔ جب لوگ اُس سے سوال پوچھتے تو جواب دینے کی بجائے وہ اُن پہ سوال کر دیتا۔ گویا وہ اُن سے کہتا کہ اپنی عقل استعمال کرو۔ سوچو تو تمہیں معلوم ہو جائے گا کہ تم اپنے سوالات کے جوابات خود جانتے ہو۔ جب عالم شرع نے سوال کیا کہ میرا پڑوسی کون ہے تو مسیح نے براہِ راست جواب نہیں دیا بلکہ نیک سامری کی تمثیل سنا دی (لوقا ۱۰ : ۲۵ - ۳۷) اور جب سنا چکا تو عالمِ شرع نے محسوس کیا کہ وہ اپنے سوال کا جواب خود دے سکتا ہے۔ یہ ساری باتیں مسیح کے مرکزی سوال کی طرف راجع ہیں "مگر تم مجھے کیا کہتے ہو"؟ (متی ۱۶ : ۱۵) مسیح یہ سوال دفعتہً یا اپنے تبلیغی زمانہ کے آغاز ہی میں نہیں پوچھتا بلکہ پہلے کئی مختلف طریقوں سے وہ اپنے آپ کو جہاں تک ممکن تھا اُن پر ظاہر کرتا ہے۔ وہ اپنے آپ کو مردوں۔ عورتوں اور بچوں پہ ظاہر کرتا ہے۔ وہ اپنے آپ کو

بطورِ اُستاد۔ شافی اور دوست پیش کرتا ہے۔ گھر میں۔ بیابان میں۔ بھیڑ کے بڑے بڑے مجمعوں میں۔ حلقۂ احباب میں۔ انفرادی شخصی گفتگو میں اپنے آپ کو ظاہر کرتا ہے۔ اور ان اظہارات میں گویا وہ یوں کہہ رہا تھا "غور سے دیکھو تو تمہیں معلوم ہو جائے گا کہ مَیں کون ہُوں"۔ چنانچہ جب یُوحنّا بپتسمہ دینے والا اُسے کہلا بھیجتا ہے کہ آنیوالا تُو ہی ہے یا ہم دُوسرے کی راہ دیکھیں؟ (متی ۱۱: ۳) تو مسیح سیدھا جواب نہیں دیتا بلکہ اُسے مطلع کرتا ہے کہ " اے یُوحنّا تُو خُود فیصلہ کر شہادت تیرے سامنے موجُود ہے۔ تُو دیکھتا ہے کہ کیا کچھ ہو رہا ہے۔ تیرے خیال میں ان سب باتوں کی کیا تفسیر ہونی چاہیئے۔

ہم سب جو والدین ہیں جب اپنے بچّوں کو یسُوع مسیح کے بارے میں سکھانے کی کوشش کرتے ہیں تو کیا ہمیں بھی ایسا ہی نہیں کرنا چاہیئے؟ ہم اُنہیں عقیدہ تو سکھا سکتے ہیں۔ ایک ہوشیار بچّہ آدھ گھنٹہ میں رسُولوں کے عقیدہ کو حفظ کر سکتا ہے۔ اور زندگی کے آخری دن تک "اُس کے بیٹے اپنے خُداوند یسُوع مسیح پر" کے الفاظ کو دہرائے جا سکتا ہے۔ ایسا پڑھنا اور سیکھنا علم ہے، ایمان نہیں۔ ایک مشہور و معروف مشنری نے ایک دفعہ ہمارے فرض کا لبِّ لباب ان الفاظ میں بیان کیا، " تمہاری تبلیغ کا مقصد یہ ہے کہ تمہارے سامعین مسیح کی جیتی جاگتی تصویر دیکھ لیں"۔ بچّوں کو سکھاتے وقت، یا غیر مسیحیوں کے سامنے گواہی پیش کرتے وقت اس سے زیادہ ہم اور کیا کر سکتے ہیں کہ یہ کوشش کریں کہ وہ مسیح کو دیکھ لیں۔ ہم اُسے اُن کی نظروں میں اُونچا اُٹھائیں۔ لیکن آخر میں ہمیں اُن سے یہ بھی ضرور پُوچھنا ہوگا کہ " تمہارے خیال میں مسیح یسُوع کون ہے؟ "

آیئے اناجیل کو پھر دیکھیں تاکہ ہمیں معلوم ہو کہ وہ اپنے آپ کو لوگوں پر کیسے ظاہر کرتا ہے۔ اور اپنے حق میں کیا دعاوی پیش کرتا ہے۔

ہم دیکھتے ہیں کہ وُہ بڑے اختیار سے تعلیم دیتا ہے۔ اور پطرس نے فوراً اُس کے اختیار کو بھانپ لیا۔" اور لوگ اُس کی تعلیم سے حیران ہُوئے۔ کیونکہ وُہ اُن کو فقیہوں کی طرح نہیں بلکہ صاحبِ اختیار کی طرح تعلیم دیتا تھا"۔ (مرقس ۱: ۲۲) اُس نے دعویٰ کیا کہ مُوسیٰ کی شریعت کی تشریح کرنا اُس کا حق ہے۔ اور تشریح کرتے ہُوئے بہت گہرے معانی پیش کئے۔" تُم جانتے ہو کہ اگلوں سے کہا گیا تھا لیکن مَیں تُم سے کہتا ہُوں"۔ (متی ۵: ۲۱-۲۲ و ۲۷ و ۲۸ و ۳۱ و ۳۲ و ۳۳ و ۳۴) عہدِ عتیق کے انبیاء کی مانند وُہ یہ نہیں کہتا "خُداوند یُوں فرماتا ہے"۔ وُہ تو کہتا ہے "مَیں تُم سے کہتا ہُوں"۔ یہ ایک زبردست دعویٰ ہے۔ یہودیوں کا مذہب پابندیٔ شریعت پر مشتمل تھا کیونکہ اُن کے نزدیک شریعت خُدا کی مرضی کا کامل مکاشفہ تھا اور یہودیوں کے خیال میں مُوسیٰ جس نے کہ یہ مکاشفہ حاصل کیا اور اُس کو لوگوں پر واضح کیا تمام بنی آدم سے معزز تھا۔ لیکن جب مسیح یہ کہتا ہے "مَیں تُم سے کہتا ہُوں" تو وُہ یہ ثابت نہیں کرنا چاہتا کہ مَیں الہٰی شخصیت ہُوں۔ یہودی جانتے تھے کہ ایک نبی کے بعد دُوسرا نبی آتا ہے اور بعض دفعہ بعد میں آنیوالے نبی کا مکاشفہ پہلے نبی کے مکاشفے کی اصلاح یا تکمیل کرتا ہے ایسا دعویٰ کرنا مسیح کی بڑی دلیری تھی لیکن متعصّب سے متعصب اور راسخ الاعتقاد یہودی بھی اس دعویٰ کو کفر نہ کہہ سکے۔

اس دعویٰ کے ساتھ ہی مسیح نے آدمیوں پر بھی بیحد اختیار کا دعویٰ کیا۔ مسیح نے اپنے شاگردوں کو اُن کے گھروں سے بلایا۔ کاروبار چُھڑا دیئے وُہ جانتا تھا کہ اُس کی بدایت کے باعث آدمیوں بلکہ خاندانوں میں بھی جُدائی پیدا ہوگی اور گو اُس نے خُود یہ سبق سکھایا کہ خاندانوں کا بنانے والا خُود خُدا پاک ہے۔ (متی ۱۹: ۴-۶) لیکن اُس نے یہ بھی سکھایا کہ اگر خاندان سے وفاداری اور مسیح

سے وفاداری کے درمیان کشمکش ہو تو اُس صورت میں خاندان کے مفاد کو رد کرنا چاہیئے اور فیصلہ ہمیشہ مسیح سے وفاداری کے حق میں ہونا چاہیئے "جو کوئی باپ یا ماں کو مجھ سے زیادہ عزیز رکھتا ہے وُہ میرے لائق نہیں اور جو کوئی بیٹے یا بیٹی کو مجھ سے زیادہ عزیز رکھتا ہے، وُہ میرے لائق نہیں" (متی ۱۰ : ۳۷) وُہ جانتا تھا کہ جو اُس کے پیچھے ہوے گا دُکھ اُٹھائے گا پھر بھی وُہ اُن کو اُن تکالیف سے محفوظ نہیں رکھتا۔ اُس کے پیچھے ہو لینا ہی سب سے ضروری بات ہے۔ کیونکہ مسیح سے وفاداری خُدا اور خُدا کی بادشاہت سے وفاداری ہے "جو تُم کو قبُول کرتا ہے وُہ مجھے قبُول کرتا ہے اور جو مجھے قبُول کرتا ہے وُہ میرے بھیجنے والے کو قبُول کرتا ہے" (متی ۱۰ : ۴۰) بعض اوقات انسانی قائدوں نے بھی اپنے معتقدوں کے سامنے ایسے دعوے کئے ہیں، اور لوگوں نے اُن کی پیروی خُوشی سے قبُول کی ہے لیکن مسیح نے صاف بتا دیا کہ وُہ یہ دعادی اس لئے کرتا ہے، کہ اُس کا رشتہ خُدا کے ساتھ ایسا رشتہ ہے جو اور کسی انسان کا نہیں ہو سکتا "میرے باپ کی طرف سے سب کچھ مجھے سونپا گیا اور کوئی بیٹے کو نہیں جانتا سوا باپ کے اور کوئی باپ کو نہیں جانتا سوا بیٹے کے اور اُس کے جس پر خُدا اُسے ظاہر کرنا چاہے" (متی ۱۱ : ۲۷)

کیا مسیح نے خُدا کا ممسُوح ہونے کا دعویٰ کیا جس کے بہت سے یہودی منتظر تھے ؟ اس سوال کا جواب صرف "ہاں" یا "نہ" ہو سکتا ہے۔ مشکل یہ تھی کہ جن کو مسیح سے ملنے کا اتفاق ہُوا اُن میں سے بیشتر یہودی ممسُوح کے بارے میں کہ وُہ کیسا ہوگا اور کیا کیا کریگا۔ منفرق خیالات رکھتے تھے۔ بعض یہودیوں کا تصوّر مسیح کے متعلق بہت بلند تھا۔ وُہ سمجھتے تھے کہ وُہ راستباز پیامبر ہوگا جو بدی کو دُور کر کے لوگوں کو خُدا کی تابعداری کی طرف پھیرے گا۔ لیکن بعض اُس آسمانی نشان

کے جو مسیح سے متوقع تھا ایسے دلدادہ تھے (متی ۱۶: ۱) کہ وہ مسیح کے اُن نشانات کو جو وہ اُن میں ہمیشہ دکھاتا رہا ہرگز نہ سمجھ سکے عوام الناس ایک بادشاہ کے منتظر تھے جو اُن کی طرف سے جنگ کرے گا اور آکر اُنہیں رومیوں کے ہاتھ سے چھڑائے گا۔ (یوحنا ۱۸: ۳۶) اور اسی تصور کے ماتحت ایک ایسا وقت آیا کہ جوش میں آکر وہ مسیح کو بادشاہ بنانے لگے (یوحنا ۶: ۱۵) بلکہ شاگرد بھی اُس کے مصلوب ہونے تک (لوقا ۲۲: ۲۸) خُدا کی بادشاہت کو دُنیا کی حکمرانی۔ تخت و تاج۔ اور انعام واکرام کے معنوں ہی سمجھتے رہے۔ (مرقس ۱۰: ۳۵-۴۰) بیشک مسیح خُدا کی مرضی کو پورا کرنے کے لئے خُدا کا ممسوح ہوکر آیا تھا لیکن وہ خُدا کی مرضی کو ایک ایسے طریقے سے پورا کرنے کو تھا جو اُس زمانہ کے کسی شخص کے تصور میں بھی نہیں تھا۔ خُدا کے مقصد کی رُو سے صحیح ممسوح ہونے کے لئے آسے یہودیوں کے تمام خیالات کو رد یا درست کرنا پڑا۔ اگر وہ اُن کے تصورات کے مطابق خُدا کا ممسوح بنتا تو خُدا کا سارا مقصد فوت ہوجاتا اِس لئے اُس نے کبھی اپنے آپ کو براہِ راست یہودیوں کے مسیح کے طور پر اُن کے سامنے پیش نہ کیا۔

تاہم جب مسیح اپنے سوال کی طرف لوٹتا ہے کہ "تم مجھے کیا کہتے ہو" تو پطرس جواب دیتا ہے کہ تو مسیح ہے۔ (متی ۱۶: ۱۵-۱۶) وہ یہ جواب سن کر بہت خوش ہوتا ہے۔ اور اس لقب کو بخوشی قبول کرتا نظر آتا ہے۔ اُس نے ایسا کیوں کیا؟ اِس لئے کہ آخر کار پطرس اُسے اُس کے معیار کے مطابق مسیح ماننے پر رضامند ہوگیا تھا۔ مسیح نے اُن کی توقعات کے مطابق کچھ نہیں کیا۔ اُس نے کوئی فوج تیار نہ کی۔ بادشاہ بننے سے بھی انکار کیا۔ بہت سے یہودی قائد اُس کے دشمن ہوچکے تھے۔ وہ فلسطین کے مقدس علاقہ سے نکل کر اب غیر قوم کے علاقہ قیصریہ فلپی

میں آگیا تھا۔ اور باوجود ان باتوں کے پطرس کہتا ہے۔ کہ تو مسیح ہے۔ تاہم اس موضوع پر ابھی اُنہیں بہت کچھ سیکھنا ہے۔ جب مسیح نے اُنہیں ممسوح کے بارے میں یہ بھی سکھایا کہ اُسے دکھ اُٹھانا ضرور ہے تو اُن پر ممسوح کے متعلق ایک اور نئی حقیقت کھل گئی۔ لیکن وہ اس حقیقت کو تسلیم کرنے کو تیار نہ تھے۔ چنانچہ پطرس بالخصوص بڑے جوش سے اس حقیقت کو رد کرتا ہے اور کہتا ہے کہ مسیح کے حق میں ایسی بات تسلیم کر لینا اُن کے لئے ناقابل برداشت ہے۔ (متی ۱۶: ۲۱-۲۸) لیکن رفتہ رفتہ وہ سیکھنے لگ گئے اور محسوس کرنے لگے کہ مسیح اُن کے ذاتی تصورات کے مطابق نہیں ہو سکتا بلکہ اُنہیں اپنے خیالات اُس کے خیالات کے مطابق ڈھالنے ہوں گے۔

مسیح خدا کی بادشاہت کا اعلان کرتے ہوئے آیا، لیکن وہ یہ لفظ ہرگز نہیں کہتا کہ "میں بادشاہ ہوں"۔ لیکن وہ یہ بات ضرور ظاہر کرتا ہے کہ چونکہ وہ آگیا ہے۔ اس لئے خدا کی بادشاہت آگئی ہے۔ "دیکھو یہاں وہ ہے جو سلیمان سے بھی بڑا ہے"۔ (متی ۱۲: ۴۲) "لیکن اگر میں بدروحوں کو خدا کی قدرت سے نکالتا ہوں تو خدا کی بادشاہی تمہارے پاس آ پہنچی"۔ (لوقا ۱۱: ۲۰) "کیونکہ دیکھو خدا کی بادشاہی تمہارے درمیان ہے"۔ (لوقا ۱۷: ۲۱) لیکن اس کا یہ مطلب نہیں کہ آسمان کی بادشاہت آدمیوں کے دلوں میں ہوتی ہے اور نہ ہی یہ کہ خدا کی بادشاہت محض باطنی روحانی ہی تجربہ ہے۔ بلکہ اس کا مطلب یہ ہے "کہ تم تو خدا کی بادشاہی کی تلاش اِدھر اُدھر کر رہے ہو لیکن اگر تمہاری آنکھ بینا ہو تو تم دیکھ لو گے کہ بادشاہی تمہارے سامنے موجود ہے"۔ (زکریاہ ۹:۹، متی ۲۱: ۱-۱۱) وہ شاگردوں سے اُس بادشاہی کا جو باپ نے اُسے دی ہے ذکر کرتا ہے اور بتاتا ہے کہ اُنہیں اس بادشاہت میں حصہ دار ہونا ہے۔

"اور جیسا باپ نے ایک بادشاہی میرے لئے مقرر کی ہے، اُسی طرح مَیں تمہارے لئے مقرر کرتا ہُوں کہ میری بادشاہی میں تُم میرے دسترخوان پر کھاؤ اور پیو اور اسرائیل کے بارہ قبیلوں کا انصاف کرنے کو تختوں پر بیٹھو" (لُوقا ۲۲: ۲۹-۳۰) وُہ کتبہ بھی جو اُس کی صلیب پہ لگایا گیا یہ تھا "یہودیوں کا بادشاہ" (لُوقا ۲۳: ۳۸) شاید پلاطُوس کو بھی معلوم نہ تھا کہ اُس نے بجا لکھا ہے۔

اب ہم اس لقب کی طرف آتے ہیں جو تمام القابات سے زیادہ یسُوع اپنے لئے استعمال کرتا تھا یعنی "ابنِ آدم" پہلی تین اناجیل میں یہ نام قریباً چالیس دفعہ مرقوم ہے اور ہمیشہ مسیح کی اپنی ہی زبان سے بولا گیا ہے۔ یوحنا کی انجیل میں یہ لقب تیرہ دفعہ آیا ہے۔ اس کے بعد باقی نئے عہدنامہ میں ایک دفعہ تو استعمال ہُوا ہے جبکہ استفنس نے بروقتِ شہادت یُوں کہا "مَیں آسمان کو کُھلا ہُوا اور ابنِ آدم کو خُدا کے دہنے ہاتھ کھڑا دیکھتا ہُوں" (اعمال ۷: ۵۶) پھر مکاشفہ میں ایک جُملہ یُوں آیا ہے "آدم زاد سا ایک شخص" (مکاشفہ ۱: ۱۳) اس محاورہ کے کیا معنی ہیں اور خُداوند مسیح اسے کیوں استعمال کرتا ہے؟ معلُوم ہوتا ہے کہ یہ ایک پیچیدہ سا جُملہ ہے۔ اور اس کی غرض یہ تھی کہ بجائے اس کے کہ وُہ لوگوں کے پہلے سوالوں کے جواب دے لوگ اُس سے اور نئے سوال پُوچھیں۔ مقدس یُوحنا کی انجیل میں ایک دفعہ (۱۲: ۳۴-۳۶) یہودی شکایت کرتے ہیں کہ یہ لفظ بہت پیچیدہ ہے اور مسیح سے براہِ راست سوال کرتے ہیں "یہ ابنِ آدم کون ہے"۔ لیکن مسیح اُنہیں کوئی جواب نہیں دیتا اور اُنہیں نُور میں چلنے کی ہدایت دیتا ہے۔ گویا وُہ جو مسیح کو دُنیا کا نُور مان کر اور اُس پہ ایمان لا کر اُس کے پاس آتے ہیں اپنے سارے سوالوں کا جواب پائینگے۔

علمائے اس لقب کے متعلق بہت مطالعہ اور تحقیق کی ہے، تاکہ اس کا ماخذ اور مطلب معلوم کر سکیں لیکن ہنوز بہت سی باتیں ہیں جو ابھی تک مخفی ہیں۔ آرمیک زبان میں ابن آدم کے معنی صرف آدمی کے ہیں اور اناجیل میں بعض مقامات ایسے ہیں جہاں یہ ترجمہ موزوں آتا ہے۔ لیکن پرانے عہدنامہ میں ایک مقام ہے جو سب مقامات سے بڑھ کر مسیح کے اس لقب کے معنی کی طرف اشارہ کرتا ہے۔ (دانی ایل ۷ باب) اس باب میں نبی چار جانداروں کی ایک رویا دیکھتا ہے اور اس رویا سے یہ ظاہر کیا گیا ہے کہ چار جاندار ظالم اور تباہ کار سلطنتوں کا نشان ہیں جو اقوامِ عالم کے درمیان اُٹھیں گی۔ پھر یہ رویا تبدیل ہوتی ہے "میں نے رات کو رویا میں دیکھا اور کیا دیکھتا ہوں کہ ایک شخص آدم زاد کی مانند آسمان کے بادلوں کے ساتھ آیا اور قدیم الایام تک پہنچا وہ اُسے اُس کے حضور لائے اور سلطنت اور حشمت اور مملکت اُسے دی گئی تاکہ سب لوگ اور اُمتیں اور اہلِ لغت اُس کی خدمت گزاری کریں۔ اُس کی سلطنت ابدی سلطنت ہے، جو جاتی نہ رہے گی اور اُس کی مملکت لازوال ہوگی۔" پھر نبی کو یہ سمجھایا گیا کہ "حق تعالیٰ کے مقدس لوگ سلطنت لے لیں گے اور ابد تک ہاں ابد الآباد تک اُس سلطنت کے مالک رہیں گے" (دانی ایل ۷: ۱۳-۱۴ و ۱۸) بد سلطنتوں کی جگہ ایک انسانی یعنی خدا کے برگزیدگان کی سلطنت آئے گی اور کبھی ختم نہ ہوگی۔

اپاکرفا میں سے ایک کتاب بنام "حنوک کی کتاب" میں ابن آدم کے حوالہ جات ملتے ہیں۔ یہاں اُسے فوق الانسان شخص پیش کیا گیا ہے۔ وہ ایک مخفی مسیح بیان کیا گیا ہے جس کا نام ابھی ہنوز ظاہر نہیں ہوا۔ وہ خدا کا برگزیدہ ہے جو کسی وقت انسانوں کا منصف اور خدا کی بادشاہی کا حاکم بن کر ظاہر ہوگا۔

اس سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ یہودیوں کے بعض حلقوں میں ابنِ آدم کا محاورہ الٰہی شخصیت کے معنوں میں استعمال ہوتا تھا لیکن ہم نہیں جانتے کہ مسیح اور اُس کے شاگردوں نے حنوک کی کتاب پڑھی تھی یا نہیں۔ یا کہ مسیح نے اس کتاب کے زیرِ اثر اپنے لئے یہ لقب منتخب کیا تھا یا نہیں۔ زیادہ ممکن یہ خیال معلوم ہوتا ہے کہ اُس نے یہ لقب دانی ایل کی کتاب سے اخذ کیا اور ایسے گہرے معنوں میں استعمال کیا جن میں اُس سے پہلے عہدِ عتیق میں کبھی استعمال نہ ہوا۔ ہم جانتے ہیں کہ مسیح نے زکریاہ کی اس نبوت پر خوب غور کیا جو صیہون میں آنے والے بادشاہ کا ذکر کرتی ہے "وہ حلیم ہے اور گدھے پر بلکہ جوان گدھے پر سوار ہے اور وہ قوموں کو صلح کا مژدہ دے گا اور اُس کی سلطنت سمندر سے سمندر اور دریائے فرات سے انتہائے زمین تک ہوگی۔" (زکریاہ ۹: ۹-۱۰) گویا ایک سلطنت ہوگی جو زمین کو معمور کرے گی اور ابد تک رہے گی لیکن یہ سلطنت عالمِ وجود میں کیسے آئے گی؟ یہ صرف خدا کی قوم یعنی یہودیوں کے وسیلہ سے آسکتی ہے۔ انہیں ابنِ آدم ہونا چاہیئے۔ مسیح کے آنے کا اوّلین مقصد یہی تھا کہ وہ خدا کے لوگوں کو توبہ کی طرف راغب کرے تاکہ وہ اپنے بلاوے کے مطابق بنیں اور صحیح معنوں میں خدا کے لوگ یعنی ابنِ آدم بن جائیں۔ لیکن لوگوں نے بطور قوم نہ سُنا اور نہ توبہ کی اور رفتہ رفتہ معلوم ہو گیا کہ شاگرد بھی ابنِ آدم ہونے کے لئے بلاوے میں شریک ہونے کو کافی نہ سمجھے۔ پس آخرکار مسیح اکیلا ہی خدا کا اسرائیل رہ گیا۔ وہی اکیلا ابنِ آدم ہے جسے سلطنت دی گئی ہے۔ اگر ہم اناجیل میں وہ سارے مقامات پڑھیں جن میں یہ محاورہ استعمال ہوا ہے (اور قارئین کو چاہیئے کہ اگر ممکن ہو تو سب کو اکٹھے رکھ کر مطالعہ کریں) تو ہمیں معلوم ہو جائے گا کہ وہ دو قسم کے ہیں (۱) ایسے

حوالہ جات جو ابنِ آدم کی موجودہ پست حالی اور دُکھوں سے متعلق ہیں (۲) وہ آیات جو ابنِ آدم کے آئندہ جلال سے متعلق ہیں۔

موجودہ حالت میں ابنِ آدم نادار و مردود ہے اور اُسے دُکھ اُٹھانا ضرور ہے "ابنِ آدم کے لئے سر دھرنے کی بھی جگہ نہیں" (لوقا ۹: ۵۸) "ضرور ہے کہ ابنِ آدم دُکھ اُٹھائے اور رد کیا جائے" (مرقس ۸: ۳۱) "ابنِ آدم تو جیسا اُس کے حق میں لکھا ہے جاتا ہی ہے لیکن افسوس اُس آدمی پر جس کے وسیلہ سے پکڑوایا جاتا ہے" (مرقس ۱۴: ۲۱) لیکن ایک دن آئے گا کہ ابنِ آدم بادشاہ اور منصف بن کر جلال میں آئے گا "جب ابنِ آدم اپنے جلال میں آئے گا اور سب فرشتے اُس کے ساتھ آئیں گے تب وہ اپنے جلال کے تخت پر بیٹھے گا" (متی ۲۵: ۳۱) "جیسے بجلی آسمان کی ایک طرف سے کوند کر دُوسری طرف چمکتی ہے ویسے ہی ابنِ آدم اپنے دن میں ظاہر ہوگا" (لوقا ۱۷: ۲۴) اُس دن جس نے دُنیا میں مسیح کو قبول کیا ہے مقبول ہوگا اور جس نے دُنیا میں مسیح کو رد کیا ہے مردود ہوگا "کیونکہ جو کوئی اس زناکار اور خطاکار قوم میں مجھ سے اور میری باتوں سے شرمائے گا ابنِ آدم بھی جب اپنے جلال میں پاک فرشتوں کے ساتھ آئے گا تو اُس سے شرمائے گا" (مرقس ۸: ۳۸ مقابلہ متی ۱۰: ۳۳)

صرف ایک موقع پر ہمارا خُداوند ممسوح اور ابنِ آدم کے خیالات کو اکٹھا کرتا ہے۔ جبکہ اُس کی خدمت کا آخری حصّہ شروع ہوتا ہے۔ اور یہودیوں کی بڑی کونسل کے سامنے اُس کی پیشی ہوتی ہے۔

خُداوند مسیح اپنی خدمت کے آخری حصّہ کے آغاز میں جبکہ یہودیوں کی بڑی کونسل کے سامنے اُس کی پیشی ہو رہی تھی ممسوح اور ابنِ آدم کے محاورات

کو اکٹھا استعمال کرتا ہے۔ سردار کاہن پوچھتا ہے "کیا تو اس ستودہ کا بیٹا مسیح ہے؟ یسوع نے کہا، ہاں میں ہوں اور تم ابن آدم کو قادرِ مطلق کی دہنی طرف بیٹھے اور آسمان کے بادلوں کے ساتھ آتے دیکھو گے" (مرقس ۱۴ : ۶۱-۶۲) اس سے ثابت ہوتا ہے کہ وہ یہودیوں کا مسیح ہے لیکن اس کی آمد کا مقصد انہیں محض دنیاوی دشمنوں سے رہائی دینے سے کہیں زیادہ بلند تھا۔ جیسا کہ دانی ایل ۷ باب کی رویا سے معلوم ہوتا ہے۔ کیا مسیح سچ کہہ رہا تھا؟ یہودی سرداروں کے خیال میں تو وہ سچ نہیں کہہ رہا تھا۔ لیکن شاگردوں کے خیال میں وہ سچ کہہ رہا تھا۔ اسی لئے گو مشکل تاہم اُن کا ایمان قائم رہا۔ اور اس لئے مسیح کی کلیسیا عالمِ وجود میں آئی۔

ضروری ہے کہ ہم مسیح کے ایک اور فیصلہ کن کلمہ پر غور کریں جس رات یسوع پکڑوایا گیا وہ شاگردوں کے ساتھ عشاء کھانے بیٹھا۔ اس نے پیالہ لیا اور شاگردوں کو دے کر یہ کہا "نئے عہد میں میرا یہ خون ہے جو بہتیروں کے لئے بہایا جاتا ہے" (مرقس ۱۴ : ۲۴) موسیٰ نے خدا کے نام میں لوگوں سے ایک عہد باندھا جو ذبح شدہ جانور کے خون کے وسیلہ سے تھا (خروج ۲۴ : ۸) لیکن اسرائیل اس عہد پر قائم نہ رہا۔ چنانچہ یرمیاہ نبی نے لوگوں کو بتایا کہ چونکہ وہ پچھلے عہد کو بھول چکے ہیں اس لئے آخری ایام میں خدا اپنے لوگوں کے ساتھ ایک نیا اور بہتر عہد باندھے گا۔ (یرمیاہ ۳۱ : ۳۱-۳۴) آخری عشاء کے وقت مسیح نے گویا یہ دعویٰ کیا کہ وہ اپنی موت کے وسیلہ سے اس نئے عہد کا اجرا کر رہا ہے۔ لہٰذا اس کے معنی یہ ہوئے کہ اس میں شریعت اور انبیاء کی تکمیل ہے۔ یہ نیا عہد گناہوں کی معافی کا عہد ہے (یرمیاہ ۳۱ : ۳۴، متی ۲۶ : ۲۸)۔ یہاں یہ لفظ کہ "بہتیروں کے لئے" اس کے معنی ہیں سب

آدمیوں کے لئے " چنانچہ اِن الفاظ سے ہمیں مسیح کا ایک اور بڑا کلمہ یاد آتا ہے "کیونکہ ابنِ آدم اِس لئے نہیں آیا کہ خدمت لے بلکہ اِس لئے کہ خدمت کرے اور اپنی جان بہتیروں کے بدلے فدیہ میں دے " (مرقس ۱۰: ۴۵) اِس کلمہ میں واضح ہے کہ مسیح اپنے کام کو خوب سمجھتا ہے۔ اور شاگرد بھی اُسی وقت مسیح کو صحیح سمجھے جب انہیں اُس کے فدیہ کا تجربہ ہُوا اور گناہ اور گناہ کی طاقت سے آزاد کئے گئے۔

قارئین کو معلوم ہو گیا ہوگا کہ ابھی تک ہمارا مطالعہ پہلی تین اناجیل میں ہی محدود رہا ہے۔ اور چوتھی انجیل کا تو کبھی ہی کوئی حوالہ دیا گیا ہے۔ چوتھی انجیل غالباً سب سے آخر میں لکھی گئی تھی۔ اسمیں پہلی تین اناجیل سے زیادہ تشریح پائی جاتی ہے۔ کیونکہ یہ خداوند کی زندگی کے بیرونی واقعات کی نسبت اُن کے گہرے باطنی مطالب سے زیادہ متعلق ہے۔ اس انجیل میں بیشتر مقامات سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ گویا مصنف ہمارے سامنے مسیح کے بولے ہُوئے الفاظ بعینہٖ اُسی صورت میں پیش نہیں کر رہا بلکہ اُن پر غور و خوض کر کے ایک نئے انداز میں یُوں پیش کرتا ہے جیسے کہ وُہ اُن کے عمیق معانی بیان کر رہا ہے۔ اگر یہ سچ ہے تو پھر اس انجیل میں سے ہم اثبات کو ویسے ہی انداز و طرز میں پیش نہیں کریں گے جیسا کہ پہلی تین اناجیل کے اثبات پیش کئے ہیں۔

انجیل کے مرکزی موضوع پر یُوحنا کی انجیل اور دیگر تین اناجیل میں کوئی فرق نہیں۔ اس انجیل میں ہمارے سامنے ایک زندہ انسانِ کامل ہے جو اپنے آپ کو لوگوں پر ظاہر کرتا ہے۔ انہیں اپنا کلام سُناتا ہے اور اپنے کام دکھاتا ہے۔ اور کوشش کرتا ہے کہ وُہ اُس پر ایمان لے آئیں۔ اور ایمان لانے کی بات کو وُہ بڑی صفائی سے پیش کرتا ہے " اگر تُم ایمان نہ لاؤ گے کہ میں

وہی ہُوں تو اپنے گُناہوں میں مروگے۔" (یُوحنّا ۸ : ۲۴) لیکن جب یہودی اُس سے سوال کرتے ہیں کہ تُو کون ہے؟ تو وُہ انہیں عجیب و غریب پیچیدہ الفاظ میں کہتا ہے "جو شروع سے تمہیں کہتا آیا ہُوں" دیگر اناجیل کی مانند یہاں بھی اُنہیں اپنا جواب آپ ہی ڈھونڈنا تھا۔

اس انجیل میں خاص غور طلب بات یہ ہے کہ مسیح اپنے لئے یہ الفاظ اکثر استعمال کرتا ہے کہ "میں ہُوں" ایک مشہور مقام پر وُہ ان الفاظ کو تن تنہا استعمال کرتا ہے اور ایسے انداز میں جس سے یہودیوں کو خُود خُدا کی ذات پاک کا بعید الفہم نام یاد آجاتا ہے "اس سے پیشتر کہ ابرہام پیدا ہُوا میں ہُوں" (یُوحنّا ۸ : ۵۸ بمقابلہ خروج ۳ : ۱۴) "میں ہُوں جو میں ہُوں" لیکن اکثر وُہ ان الفاظ کے ساتھ کوئی استعارہ استعمال کرتا ہے جس کے ذریعے سے وُہ لوگوں کی توجہ اپنے آنے کے مقصد کے کسی اہم نکتہ کی طرف مبذول کرتا ہے۔ مقدس یوحنّا کی انجیل میں سے بالترتیب "میں ہُوں" والی آیات کو تحریر کرنا مفید ثابت ہوگا۔

۶ : ۴۸ "زندگی کی روٹی میں ہُوں" اس کے ساتھ ہی ۶ : ۵۱ "زندہ روٹی میں ہُوں"

۸ : ۱۲ "دُنیا کا نُور میں ہُوں"

۱۰ : ۷ "بھیڑوں کا دروازہ میں ہُوں"

۱۰ : ۱۱ "اچھا چرواہا میں ہُوں، اچھا چرواہا اپنی بھیڑوں کے لئے اپنی جان دیتا ہے"

۱۱ : ۲۵ "قیامت اور زندگی تو میں ہُوں"

۱۴ : ۶ "راہ حق اور زندگی میں ہُوں"

۱۵ : ۱ "انگور کا حقیقی درخت میں ہوں"

آپ نے غور کیا ہوگا کہ ان کلمات میں سے بیشتر نور اور زندگی کے بڑے مضامین سے متعلق ہیں اور انہیں مضامین پر یہ انجیل زیادہ تر مشتمل ہے۔ "اور زندگی آدمیوں کا نور تھی" (یوحنا ۱ : ۴) اور انہیں دو چیزوں کے اظہار اور تعمیل کے لئے مسیح آیا۔ وہ آیا کہ نادیدہ خدا کو ظاہر کرے۔ وہ آدمیوں کے لئے خدا کی زندگی لے کر آیا۔ تاکہ وہ زندگی پائیں اور کثرت سے پائیں۔ (یوحنا ۱۰ : ۱۰) شاید ہم اس سے یہ کہنے کی توقع کرتے "میں زندگی کی روٹی میں دیتا ہوں" "میں تمہیں رستہ دکھاتا ہوں" "میں تمہیں حق بتاتا ہوں" لیکن وہ یوں نہیں کہتا ہے۔ وہ اپنا پیغام اپنی ذات سے جدا نہیں کر سکتا۔ ہم مسیح کے الفاظ کا یقین نہیں کر سکتے جب تک کہ ہم مسیح کا یقین نہ کریں۔ ہم اس کے احکام بجا نہیں لا سکتے تاوقتیکہ اسے اپنا مالک تسلیم نہ کریں۔ اپنے پیغام اور اپنے اعلان کا مرکز وہ خود ہی ہے۔

ایک مقام پر وہ بالکل عنقریب کہنے کو ہے کہ "میں خدا کا بیٹا ہوں" (یوحنا ۱۰ : ۳۶) مگر یہاں بھی وہ دیگر ایسے آدمیوں کا ذکر کرتا ہے جن کو خدا کا کلام حاصل ہوا اور اس بنا پر انہیں (زبور ۸۲ : ۶ میں) "الٰہ" کہا گیا لیکن اس نے جسے باپ نے مقدس ٹھہرایا اور دنیا میں بھیجا باقی تمام آدمیوں سے بڑھکر اور زیادہ مکمل طور پر کلام حاصل کیا۔ جو دوسروں نے ادھورا چھوڑ دیا اسے اس نے تمام کیا۔ وہ اس کام کی تکمیل ہے جسے خدا کے بھیجے ہوئے لوگوں نے شروع کیا تھا۔

ایک اور فرمان میں وہ اس سے بھی اور آگے بڑھتا ہے اور ۱۰ : ۳۰ میں دعویٰ کرتا ہے کہ "میں اور باپ ایک ہیں" لیکن وہاں بھی ظاہر ہے کہ

وُہ باپ کے ساتھ اُس کی مرضی اور مقصد میں ایک ہے ۔ وُہ بیٹا ہے کیونکہ وُہ باپ کی مرضی کو جانتا ہے۔ اور اُس کی مرضی کے پُورا پُورا تابع ہے ۔ وُہ آپ سے کچھ نہیں کرتا ۔ "بیٹا آپ سے کچھ نہیں کرتا سوا اُس کے جو باپ کو کرتے دیکھتا ہے" (۵ : ۱۹) اور یہی سبب ہے کہ " باپ بیٹے سے محبت رکھتا ہے اور اُس نے سب چیزیں اُس کے ہاتھ میں دے دی ہیں" (۳ : ۳۵)

زیرِ بحث مبحث کے اس مقام تک ہم پر بہت کچھ روشن ہو گیا ہے ۔ لیکن ہنوز بہت سے سوالات باقی ہیں ۔ اگلے باب میں ہم یُوحنّا کی انجیل کی ابتدائی آیات کی طرف رُخ کریں گے جن میں مصنّف ہم پر واضح کرتا ہے کہ وُہ خُود مسیح کو باپ کے ابدی کلام کی حیثیت میں کیسے سمجھتا ہے اور کہ مصنّف اس کلام کے بارے میں جو ہماری خاطر مجسّم ہُوا اور فضل اور سچائی سے معمُور ہو کر ہمارے درمیان رہا کیا سوچتا ہے (یُوحنّا ۱ : ۱ - ۱۴) یہاں ہم آپ کی توجہ انجیل کے اختتام کی طرف دلاتے ہیں جہاں کہ مصنّف بتاتا ہے کہ اُسے یہ انجیل لکھنے سے کیا مقصود ہے (اور حقیقت یہ ہے کہ یہ مقصد بھی وُہی ہے جو دیگر اناجیل کے مصنفین کا ہے) " یہ اس لئے لکھے گئے کہ تم ایمان لاؤ اور کہ یسُوع ہی خُدا کا بیٹا مسیح ہے اور ایمان لا کر اُس کے نام سے زندگی پاؤ" (یُوحنّا ۲۰ : ۳۱)

چوتھا باب

سمجھنے کی کوشش ۲

ربنا المسیح اپنے دوستوں کے لئے ایک جلیل القدر تجربہ چھوڑ گیا یعنی ایک ایسی خوشی دے گیا جو بے بیان جلال سے معمور ہے۔ وُہ اُنہیں ایک زبردست اختیار سونپ گیا کہ وُہ تمام مخلوقات کو انجیل مقدس کا رُوح افزا پیغام سنائیں اور ایک بڑا کام اُن کے سپرد کر گیا کہ وُہ زیادہ سے زیادہ معلوم کرتے جائیں کہ مسیح کون ہے۔ خداوند مسیح کے جی اُٹھنے کے پچاس سال بعد تک کلیسیا میں کوئی فیصلہ شدہ عقیدہ نہ تھا اور نہ کوئی مقررہ اصطلاحات میں مرتب مسائل تھے جو مسیحیوں کے لئے ماننا لازمی ہوں۔ بلکہ سب ایمانداروں میں یہ تجربہ یکساں تھا یعنی سب ایماندار یہ ضرور جانتے تھے کہ "خداوند نے اپنی اُمت پر توجہ کرکے اُسے چھٹکارا دیا" (لوقا ۱: ۶۸) کہ وُہ اُنہیں موت سے زندگی میں لایا ہے۔ وُہ رُوح کی یگانگی میں رہتے تھے۔ وُہ اپنے اندر گناہ کی طاقت پر غالب آنے کی قوت اور گواہی دینے کی طاقت محسوس کرتے تھے۔ اور اُس جلال کی اُمید میں جو ظاہر ہونے کو تھا زندگی گزارتے تھے (رومی ۸: ۱۸) وُہ جلال جو اُس وقت ظاہر ہوگا جب خدا کا بیٹا آسمان سے پھر آئے گا۔ (۱ تھسلنیکی ۱: ۱۰) مگر ہر ایک ایماندار کو آزادی تھی کہ وُہ اپنے تجربہ کو اپنے ہی

بہترین الفاظ میں بیان کرے لیکن اُن کا تجربہ کچھ ایسا بڑا اور عجیب تھا کہ کوئی واحد صورت اور کوئی ایسے مقررہ الفاظ نہیں تھے جو اُس تجربہ کو تمام زبیان کرسکیں اور بلا شبہ یہ اُن کے اظہار الایمان کے انواع و اقسام کے الفاظ و محاورات اور اصطلاحات سے ہی ہمیں ابتدائی کلیسیا کی قوتِ ایجاد صاف صاف نظر آتی ہے۔

ایسے حالات میں ابتدائی مسیحی یسوع المسیح کے متعلق کیا سوچتے تھے؟ اور ربنا المسیح کے سوال کا کہ "تم مجھے کیا کہتے ہو"؟ وہ کیا جواب دیتے تھے؟ اس کا جواب دینے کا ایک سادہ سا طریقہ ہے۔ کہ اُن ناموں اور القاب پر غور کیا جائے جو وہ مسیح کے لئے استعمال کرتے تھے۔ ایک عالم نے حال ہی میں ایک کتاب لکھی ہے جسمیں اُس نے پچاس نام اور القاب جو عہدِ جدید میں مسیح کے لئے استعمال ہوئے ہیں جمع کئے ہیں اور اُس نے ایک عجیب حقیقت بے نمایاں کی ہے کہ تمام بعد کی صدیوں میں کلیسیا نے صرف ایک لقب بڑھایا ہے "منجی" جو نئے عہد نامہ میں استعمال نہیں ہوا لیکن مسیحیوں میں عام مستعمل ہے۔ ان القابات میں سے بہت سے خوبصورت استعارے ہیں جن میں سے بعض تو مسیح نے خود استعمال کئے ہیں مثلاً "گڈریا"۔ لیکن کئی ایک ایسے ہیں جو مسیحی مصنفین نے خود ایجاد کئے ہیں مثلاً "یہوواہ کا شیر ببر" (مکاشفہ ۵: ۵) بالفرض اگر ہم ان سارے استعاروں کو خارج از مطالعہ رکھیں اور صرف علم الہٰیات کی خاص اصطلاحات کا بالتفصیل مطالعہ کریں تو بھی اس کتاب کے اوراق کافی نہ ہوں گے۔ اس لئے ضروری ہے کہ ہم چند ایک بڑے بڑے ناموں کو چن لیں اور اُن کا مطالعہ کریں تاکہ معلوم کرسکیں کہ ابتدائی مسیحیوں کا علم المسیح کس طرح رفتہ رفتہ صاف اور پکا ہوتا گیا۔ بائبل کے مؤدب طالب علم

کو یہ مطالعہ بڑا دلچسپ معلوم ہوگا اور کسی کے پاس اگر کلید الکتاب ہو تو اُسے اس موضوع پر مزید تحقیق کرنے میں کوئی دِقت نہیں ہوگی۔

لفظ "یسوع":- یہ شخصی نام ہے جو مسیح کو آٹھویں دن ختنہ کے موقع پر دیا گیا۔ (لوقا ۲: ۲۱) اور نئے عہد نامہ میں باقی تمام ناموں اور القاب سے زیادہ عام نام ہے۔ انجیلی خطوط میں یہ نام اکثر بعض دیگر الفاظ کے ساتھ استعمال کیا گیا ہے، مثلاً "خداوند یسوع مسیح" لیکن اناجیل میں جو کہ ہمیں المسیح کی زمینی انسانی زندگی اور کام کے بارے میں یاد دلاتی ہیں یہ نام سینکڑوں آیات میں واحد استعمال ہوا ہے۔

بعض ابتدائی مسیحی بلاشبہ اس نام کے عبرانی معنوں کو جانتے ہوئے اس کا استعمال کرتے تھے یعنی "نجات دہندہ"۔ "تو اُس کا نام یسوع رکھنا، کیونکہ وُہی اپنے لوگوں کو اُن کے گناہوں سے نجات دے گا"۔ (متی ۱: ۲۱) "یسوع" وُہی لفظ ہے جو پرانے عہد نامہ میں "یشوع" ہے اور چونکہ ابتدائی مسیحی اکثر دیکھتے تھے کہ اُس میں وُہ سب کچھ پورا ہوا ہے جو پرانے عہد نامہ میں پیشینگوئی کے طور پر ہے تو یقیناً اُن کے دِل میں یہ خیال بھی آتا ہوگا کہ جیسے یشوع قوم اسرائیل کو بیابان سے نکال کر موعودہ ملک میں لایا ویسے ہی مسیح اپنے لوگوں کو ابدی نجات کے حقیقی ملکِ موعود میں لایا۔

مندرجہ بالا خیال کے ماتحت بڑے تعجب کی بات ہے کہ لفظ "منجی" نئے عہد نامہ میں اتنا کم مستعمل ہوا ہے اور اناجیل میں صرف دو دفعہ آیا ہے۔ (لوقا ۲: ۱۱ و یوحنا ۴: ۴۲) اور دو ہی دفعہ اعمال کی کتاب میں (۵: ۳۱ و ۱۳: ۲۳) اور دو دفعہ پولس کے خطوط میں (فلپی ۳: ۲۰، افسی ۵: ۲۳)۔ "دُنیا کا نجات دہندہ" کا جملہ صرف دو دفعہ آیا ہے (یوحنا ۴: ۴۲ و ۱ یوحنا

۴ : ۱۴) ابتدائی مسیحی اس جملہ کو اتنا کم کیوں استعمال کرتے تھے ؟ حالانکہ وہ "بچایا جانا" کا جملہ عام استعمال کرتے تھے مثلاً (رومی ۵ : ۹) "اُس کے وسیلہ سے غضبِ الٰہی سے ضرور ہی بچیں گے"۔ (رومی ۵ : ۱۰) "ہم اُس کی زندگی کے سبب سے ضرور ہی بچیں گے"۔ علماء کا خیال ہے کہ مسیحی "مُنجی" کے لفظ سے شائد اس لئے پرہیز کرتے تھے کیونکہ یہی لقب بُت پرست لوگ اپنے بہت سے دیوتاؤں کو دیتے تھے اور خاص طور سے اس لئے کہ رومی قیصر کے لئے استعمال کیا جاتا تھا لیکن وہ نجات جو مسیح لے کر آیا تھا اُس "تحفظ" سے بالکل الگ تھلگ تھی جو رومی قیصروں نے بچپن دُنیا کے لئے مہیا کیا۔ اور شائد اُن دو میں فرق قائم رکھنے کی غرض سے مسیحیوں نے اس محاورہ سے پرہیز کرنا واجب سمجھا۔

مُقدس پولُس رسُول بعض دفعہ لفظ "یسُوع" اکیلا استعمال کرتا ہے ۔ اور وہ بھی اُس وقت جبکہ وہ مسیح کے انسانی خصائل پر بالعموم اور مسیح کے جسم میں ظاہر ہونے کی کمزوری پر بالخصوص زور دینا چاہتا ہے (۲ کرنتھی ۱۴ : ۴) چنانچہ (۲ کرنتھیوں ۴ : ۱۰-۱۱) میں وہ یُوں لکھتا ہے۔ "ہم ہر وقت اپنے بدن میں یسُوع کی موت لئے پھرتے ہیں تاکہ یسُوع کی زندگی بھی ہمارے بدن میں ظاہر ہو۔ کیونکہ ہم جیتے جی یسُوع کی خاطر ہمیشہ موت کے حوالہ کئے جاتے ہیں تاکہ یسوع کی زندگی بھی ہمارے فانی جسم میں ظاہر ہو"۔

ان خاص معانی کے علاوہ اس لقب کا مسلسل استعمال یُوں بھی اہم ہے کہ اس سے ایمان ایک ایسے شخص کی زندگی اور کاموں سے منسلک ہو جاتا ہے جو فی الحقیقت عالم ہست وبُود میں تھا۔ اور تواریخ میں ہم اُس کی جگہ اور وقت معین کر سکتے ہیں ۔ آج ہم یہ سُن سُن کر تنگ آجاتے ہیں کہ دُنیا کے تمام بڑے مذاہب کے خیالات اور تعلیمات ایک ہی ہیں۔ لیکن یہ نظریہ درست نہیں اور اس کی تصدیق

میں یہ کہا جا سکتا ہے کہ تمام مذاہب میں گناہوں کی معافی کی تعلیم بالکل فرق فرق ہے۔ اگر سب مذاہب کی تعلیم ایک ہی ہے تو گناہوں کی معافی کے متعلق بھی ایک ہی ہونی چاہیئے۔ حوالہ جات کے بغور انتخاب سے شائد ہندو اور بدھ مذہب میں اور شائد دیگر مذاہب میں بھی محض ایک ایسی باتیں ملیں جو اناجیل کے خیالات سے ملتی جلتی ہوں لیکن مسیحیت تصورات و قیاسات اور مقولوں کا مذہب نہیں مسیحیوں نے اپنی دُنیا کے لوگوں کے سامنے کوئی ایسے خیالات پیش نہ کئے تھے جو ہر ایک کے آزمانے پر برحق ثابت ہوں۔ بلکہ اُنہوں نے ایک شخص کو پیش کیا جو زندہ تھا اور مُوا۔ جسے شاگردوں نے دیکھا اور جانا۔ جسے اُن کے ہاتھوں نے چھُوا اور جو اُس کے ساتھ سچ مچ گوشت اور خون میں شامل ہُوئے (عبرانی ۲: ۱۴) نجات یافتہ ہونے کا مفہوم یہ ہے کہ "میں اُس کو اور اُس کے جی اُٹھنے کی قدرت کو (جانوں)" (فلپی ۳: ۱۰)

لفظ "مسیح":۔ مسیحیوں میں الفاظ یسُوع المسیح متواتر یُوں اکٹھے مستعمل ہیں کہ ہم اکثر یہ سمجھتے ہیں کہ مسیح اور یسُوع ایک ہی بات ہے۔ اور گویا یہ شخصی نام ہے اُس شخص کا جس نے اس مذہب کی بنیاد رکھی اور شاید ہمیں یہ سُنکر حیرانی سی ہوگی کہ یہ درست نہیں۔ مسیح نام نہیں بلکہ ایک لقب ہے جس کے معنی ہیں "خداوند کا مسح کیا ہُوا"۔ یہ یُونانی لفظ ہے جس کے مقابلہ میں عبرانی کا لفظ "مسیح" ہے۔ یُونانی میں عہد عتیق پڑھنے والوں کو ہم سے زیادہ اس لفظ کی سمجھ ہوگی کیونکہ وہ خُوب سمجھتے ہیں کہ یہ لفظ مسیح کس رنگ میں استعمال ہُوا ہے مثلاً جب داؤد اُس جوان سے پُوچھتا ہے کہ ساؤل بادشاہ کو کس نے قتل کیا (۲ سموایل ۱: ۱۴) "تُو خُداوند کے ممسُوح کو ہلاک کرنے کے لئے اُس پر ہاتھ چلانے سے کیوں نہ ڈرا؟" یُونانی میں خُدا کے ممسُوح کے لئے خُدا کا مسیح آیا ہے لیکن

پھر بھی یہ بات صاف ظاہر ہے کہ جو کچھ آج ہم محسوس کرتے ہیں ابتدا ہی سے مسیحیوں کو محسوس ہونے لگ گیا تھا یعنی یہ کہ ہمارا مسیح وہ مسیح نہیں جس کے یہودی اُمیدوار تھے اور اس لئے اُنہوں نے لفظ مسیح کو یسُوع ناصری کے لئے بطور شخصی نام استعمال کرنا شروع کر دیا۔

ہم دیکھ چکے ہیں کہ خُود مسیح نے یہ لقب شاذ و نادر ہی اپنے لئے استعمال کیا اور ہم نے یہ سمجھنے کی بھی کوشش کی کہ کیوں وہ اس لقب کو اکثر استعمال نہیں کرتا تھا۔ ہم دیکھتے ہیں کہ اناجیل میں بیشتر دُوسرے لوگ یہ لقب اُس کے حق میں استعمال کرتے ہیں۔ بعض دفعہ اظہار الایمان کے طور پر۔ بعض دفعہ بحث و مباحثہ کی صُورت میں جیسا کہ یُوحنا ۷ : ۲۶ میں مرقوم ہے کیا یہ ہو سکتا ہے کہ ارباب اختیار جانتے تھے کہ یہی مسیح ہے ؟ یسُوع کی زمینی زندگی کے ایام میں یہی اہم مسئلہ تھا۔ کہ آیا یہودی یسُوع کو مسیح قبُول کرتے ہیں یا نہیں اور حالانکہ اناجیل مسیح کے کافی دیر بعد لکھی گئیں بلکہ بہت سے خطوط کے بھی بعد تصنیف ہُوئیں، تاہم وہ اُس کی زندگی کے واقعات کی سچّی گواہ ہیں۔ اور تقریباً ہر مقام پر یہ واضح ہے کہ "مسیح" لقب ہے اور اس کے معنی ہیں "ممسُوح"۔

رسُولوں کے اعمال میں بھی ایسا ہی ہے۔ رسُولوں کی پہلی پہلی تبلیغ میں اُن کا اوّل مقصد یہ تھا کہ وہ یہودی سامعین کو قائل کریں کہ یسُوع ہی وہ مسیح ہے جس کی یہودی قوم منتظر ہے۔ مسیحیوں اور یہودیوں میں بڑا فرق یہ تھا کہ مسیحی تو تسلیم کرتے تھے کہ مسیح آچکا ہے اور وہ مسیح یسُوع ہے "پس اسرائیل کا سارا گھرانا یقین جان لے کہ خدا نے اُسی یسُوع کو جسے تم نے صلیب دی خُداوند بھی کیا اور مسیح بھی" (اعمال ۲ : ۳۶) چنانچہ جہاں کہیں ہم "خُداوند یسُوع مسیح" کا محاورہ بھی دیکھتے ہیں وہاں بھی لفظ "مسیح" میں لقب کا رنگ ہے

اسم معرفہ نہیں جب برنباس اور پولُس کے متعلق یہ کہا گیا کہ" یہ دونو ایسے آدمی ہیں جنہوں نے اپنی جانیں ہمارے خُداوند یسُوع مسیح کے نام پر قُربان کر رکھی ہیں" (اعمال ۱۵ : ۲۵-۲۶) تو اس کا یہ مطلب ہے کہ پولُس اور برنباس یہودیوں میں یسُوع کو بطور مسیح پیش کرتے رہے تھے جس کا اُنہیں انتظار تھا۔ اسی سبب سے وُہ جو یہ منادی ماننے کو ہرگز تیار نہ تھے اُنہیں ایذا پہنچاتے تھے (۲ کرنتھی ۱۱ : ۲۳-۲۸)

البتّہ جب ہم رسُولوں کے خطُوط کی طرف رجُوع کرتے ہیں تو وہاں ہمیں ایک بڑی تبدیلی نظر آتی ہے۔ پولُس یقیناً مانتا تھا کہ یسُوع ہی مسیح ہے۔ اور رُومیوں ۱ : ۳ میں وُہ اسی نکتہ کی طرف اشارہ کرتا ہے۔" اپنے بیٹے ہمارے خُداوند یسُوع مسیح کی جو جسم کے اعتبار سے تو داؤد کی نسل سے پیدا ہُوا" اور اسی خط میں وُہ اس خیال کا اعادہ کرتا ہے۔ (۹ : ۵)" اور جسم کی رُو سے مسیح بھی اُن ہی میں سے ہُوا"۔ لیکن جب وُہ اُن کلیسیاؤں کو لکھتا ہے جن میں غیر یہودی شرکاء کی کثرت تھی تو وہاں وُہ اس حقیقت پر بہت کم زور دیتا ہے کہ یسُوع ہی یہودیوں کا مسیح ہے۔ یسُوع کے بارے میں گہری باتیں بتانے کے لئے اُسے اور طرح کے الفاظ تلاش کرنے پڑتے ہیں جن میں سے بعض پر ہم بعد میں غور کریں گے۔ لفظ "مسیح" پولُس کے چہیتے جُملہ" ہمارا خُداوند یسُوع مسیح" میں بھی اپنے حقیقی یہودی معنوں سے خالی ہے اور یسُوع کے لئے گویا دُوسرے نام کی حیثیت رکھتا ہے۔ پولُس کی یہ بات خطُوط کے دیگر مصنّفین کے حق میں بھی دُرست ہے۔

سوال پیدا ہوتا ہے کہ یہ تبدیلی کیونکر پیدا ہُوئی؟ یقیناً ایک سبب یہ ہے کہ عہد جدید کے زمانہ کے آخر تک یہودی قوم یسُوع کو مسیح تسلیم کرنے سے صاف

انکار کر چکی تھی۔ اور مسیحیوں کی اکثریت غیر یہودی اصل سے تھی۔ اور یہ لوگ انکار نہیں کرتے تھے کہ یسوع مسیح ہے۔ وہ پرانا عہد نامہ پڑھتے تھے اور اُسے کلیسیا کا نوشتہ مانتے تھے۔ اور مقدس متی کی انجیل یہی ظاہر کرنے کے لئے لکھی گئی یا کم از کم اس بات پر خاص زور دیتی ہے کہ یسوع ہی مسیح ہے۔ عہدِ عتیق انجیل کے لئے گویا ایک درازہ تیاری تھی جس سے انجیل جُدا نہیں کی جا سکتی۔ آج یہودیوں کے لئے مسیحیوں کا پیغام یہ ہے کہ اُن کا مسیح آ چکا ہے۔ گو وہ اُسے یسوع میں پہچان نہیں رہے لیکن اس پیغام کی غیر یہودی مسیحیوں کے لئے کوئی خاص اہمیت نہیں تھی۔ یہودیوں کی مسیح سے یہ توقع تھی کہ وہ انہیں شان و شکوہ بخشے گا۔ وہ تو ایسے مسیح کی اُمید رکھتے تھے جو یہودیوں میں سے اور یہودیوں ہی کے لئے ہو۔ یسوع اس لئے آیا کہ یہودیوں کو اس قابل بنائے کہ وہ اپنے بلاوے کے مقصد کو پورا کریں اور یہ وہی مقصد تھا جو اس سے بہت پیشتر خُدا نے ابرہام کے بلاوے میں ظاہر کر دیا تھا کہ "تیرے وسیلہ سے دُنیا کے سب قبیلے برکت پائیں گے"۔ (پیدائش ۱۲: ۱-۳) یسوع میں یہ بات پوری ہو گئی اور سب ایمانداروں کے لئے آسمان کی بادشاہت کے دروازے کھُل گئے۔ یہودیوں اور غیر یہودیوں میں فرق نہ رہا کیونکہ مسیح نے دونو کو ایک کر کے اپنے آپ میں ایک نیا انسان پیدا کر دیا (افسیوں ۲: ۱۵) اب صرف ایک ہی دروازہ ہے اور یہ خیال کہ یسوع ہی مسیح ہے، اتنا اہم نہیں رہا جتنا کہ یہ خیال کہ یسوع دُنیا کا نجات دہندہ ہے۔

خُداوند کا خادم:۔ اعمال کے پہلے آٹھ ابواب میں مقدس لوقا یروشلم میں سب سے ابتدائی مسیحیوں کے تجربات بیان کرتا ہے۔ اور اُن کی ابتدائی مساعی کا ذکر کرتا ہے جو اُنہوں نے مسیح کے جی اُٹھنے اور پاک رُوح کے نازل ہونے کی روشنی میں مسیح کو سمجھنے کے لئے ہیں۔ یہ مساعی زیادہ تفصیل کے ساتھ

پطرس اور دیگر شاگردوں کی تقاریر پیش کی گئی ہیں ۔ یہ دیکھنا بڑی دلچسپ بات ہے کہ ان تقاریر میں کیا کچھ موجود ہے ۔ اور کئی امور جو بعد میں سکھائے گئے ان تقاریر میں معدوم ہیں سب سے پہلی بات جو یہاں نمایاں ہے ، ایک لقب ہے جو مسیح کے لئے استعمال کیا گیا ہے جو باقی سارے نئے عہدنامہ میں کہیں نہیں ملتا یعنی " خادم " (اعمال ۳ : ۱۳ و ۲۶ و ۴ : ۲۷ ، ۳۰)

یہ لقب کہاں سے آیا ؟ یہودیوں کے لئے جو عہد عتیق سے واقف تھے اس لقب کی اصل کو جاننا کچھ مشکل نہ تھا ۔ یسعیاہ نبی کی کتاب کے دوسرے حصہ میں چار " خادم کے گیت " پائے جاتے ہیں جو کہ عہدِ عتیق کی نبوت کے شاندار حصوں میں سے ہیں ۔ پہلا گیت (یسعیاہ ۴۲ : ۱-۹) میں ہے ۔ " دیکھو میرا خادم جسے میں سنبھالتا ہوں " ۔ اور آخری گیت " مظلوم خادم " کا گیت ہے جو (یسعیاہ ۵۲ : ۱۳ و ۵۳ : ۱۲) میں پایا جاتا ہے " اپنے ہی عرفان سے میرا صادق خادم بہتوں کو راستباز ٹھہرائے گا ۔ وہ اُن کی بدکرداری خود اُٹھائے گا ۔ ہم اس امر کو تسلیم نہیں کرتے کہ مسیح سے قبل کسی یہودی مفسر نے یہ کلمات مسیح یا ممسوح سے منسوب کئے تھے ۔ اور برعکس اس کے مسیحی تعلیم کا لازمی جزو یہ تھا کہ اُس بادشاہ کو جس نے آکر سلطنت کرنا تھا اور خدا کے خادم کو جس نے دُکھ اُٹھانا تھا ، ایک ہی شخص میں اکٹھا کریں ۔ یہ دو خیالات کیسے اکٹھے کئے گئے ؟

یہ بات اعمال ۸ : ۲۶-۴۰ سے صاف طور سے ظاہر ہے کہ ابتدائی مسیحی مبلغین اپنے سامعین پر یسوع کے دُکھوں میں خدا کا بھید ظاہر

کرنے کی غرض سے یسعیاہ باب ۵۳ کو اکثر استعمال کرتے تھے۔ وہ حبشی سردار یہی مقام پڑھ رہا تھا" تب فلپس نے اپنی زبان کھول کر اُس نوشتہ سے شروع کر کے اُسے یسوع کی خوشخبری سُنائی" (اعمال ۸: ۳۵) مقدس متی مسیح کی خدمت کے مختلف پہلوؤں کو بیان کرنے کے لئے دو دفعہ خادم کی نبوتوں کی طرف اشارہ کرتا ہے۔ شفا دینے کے کام کے باب میں وہ یسعیاہ ۵۳: ۴ سے اقتباس کرتا ہے "اُس نے آپ ہماری کمزوریاں لے لیں اور بیماریاں اُٹھا لیں"۔ مسیح کی اِس نصیحت کی کہ لوگوں کو نہ بتانا کہ مَیں کون ہُوں تشریح کرتے ہوئے وہ یسعیاہ ۴۲: ۱-۴ سے اقتباس کرتا ہے "دیکھو یہ میرا خادم ہے جسے مَیں نے چُنا...یہ نہ جھگڑا کرے گا نہ شور نہ بازاروں میں اُس کی کوئی آواز سُنے گا" (متی ۱۲: ۱۸-۲۱) یہ تشریح نہ صرف متی اور لوقا کی اناجیل میں پائی جاتی ہے، بلکہ اُس کی گونج فلپیوں کے مشہور خط میں بھی سُنائی پڑتی ہے۔ جو بعض علماُ کے خیال کے مطابق ایک پُرانے مسیحی گیت سے اقتباس ہے "اُس نے اپنے آپ کو خالی کر دیا اور خادم کی صورت اختیار کی"۔

اناجیل اربعہ میں مسیح یہ لقب اپنے لئے کہیں بھی استعمال نہیں کرتا لیکن ہمیں یقین ہے کہ یسعیاہ کے آخری ابواب عہدِ عتیق کا ایک ایسا حصّہ تھا جس پر اُس نے گہرے طور پر غور کیا اور جس میں سے اُس نے اُس کام کے بارے میں بہت کچھ سیکھا تھا جسے وہ انجام دینے کو تھا۔ ناصرت میں اُس نے اپنے پہلے وعظ میں اُن ہی نبوتوں میں سے اقتباس کیا "خداوند کا رُوح مجھ پر ہے" (یسعیاہ ۶۱: ۱-۲ + لوقا ۴: ۱۸-۱۹) اور مقدس لوقا ہمیں یہ بھی بتاتا ہے کہ یسوع نے اپنے دکھوں میں یسعیاہ ۵۳: ۱۲ کو

پُورا ہوتے دیکھا " وُہ خطاکاروں میں شمار کیا گیا "۔ (لُوقا ۲۲: ۳۷)
سوال پیدا ہوتا ہے کہ جب کلیسیا نے لقب " خادم " کا استعمال شروع کیا تو پھر بعد میں اُسے کسی حد تک ترک کیوں کر دیا ؟ اس کا جواب غالباً مسیح کے جی اُٹھنے کے پُورے معانی کی فہمیت میں ملتا ہے جو مسیحیوں کو اُس وقت حاصل ہُوئی جبکہ وُہ جی اُٹھے ہُوئے مسیح کی رفاقت میں رہے۔ وُہ یسُوع جسے کلیسیا جانتی تھی اور پیار کرتی تھی وُہی یسُوع تھا جو انسان تھا اور جس نے زمین پر رہ کر دُکھ اُٹھائے۔ لیکن اب کلیسیا کی زندگی جی اُٹھے ہُوئے مسیح کی رفاقت اور اُس کے جلال کی شراکت میں گزرتی تھی۔ قیامت مسیح کے تجربہ کے بعد وُہ اُس حالت کی طرف لوٹ نہیں سکتے تھے جو مسیح کے زندہ ہونے سے پہلے شاگردوں کی تھی۔ شاید وُہ یہ محسُوس کرتے تھے کہ " خادم " کا لقب زیادہ تر مسیح کے جی اُٹھنے سے پہلے کے کام سے متعلق ہے۔ اور اب جبکہ وُہ جلال کا خُداوند ہے یہ لقب اُس کے لئے موزوں نہیں۔ نئے عہد نامہ کے زمانہ کے لگ بھگ کی مسیحی کُتب اور دُعاؤں میں بعض بعض جگہ یہ لقب ملتا ہے لیکن یہ لقب عام طور پر مستعمل نہیں۔ اس لقب کے وسیلے سے ہم اپنے خُداوند کے کام اور موت کے معنوں کو بہت کچھ سمجھ سکتے ہیں۔ اور آج جبکہ ہم دُعا میں اُس سے خطاب کرتے ہیں تو یہ لفظ آسانی سے ہماری زبان پر نہیں آتا۔

لفظ " خُداوند "۔ اب ہم اُس لقب کو لیں گے جو شاید تمام القاب سے زیادہ اہم ہے۔ مقدس پولُس " خُداوند " کے لقب کو اپنی تحریرات میں کم از کم دو سو بار استعمال کرتا ہے اور ہر ممکن بندش میں استعمال کرتا ہے۔ مثلاً " ہمارا خُداوند "۔ " ہمارا خُداوند یسُوع مسیح "۔ " یسُوع مسیح ہمارا خُداوند "۔ " خُداوند مسیح " وغیرہ وغیرہ۔ اور اس لقب کو خُداوند کی زندگی اور

اور کام اور جی اُٹھنے اور کلیسیا میں موجود ہونے کے تعلق میں استعمال کرتا ہے۔ باقی تمام خطوط میں بھی یہ لقب پایا جاتا ہے۔ اور مکاشفہ میں بھی ہم یہ شاندار الفاظ دیکھتے ہیں "بادشاہوں کا بادشاہ اور خداوندوں کا خدا" (مکاشفہ ۱۹ : ۱۶)

معلوم ہوتا ہے کہ ابتدائی کلیسیا کا ایمانی عقیدہ صرف یہ تھا "یسوع خداوند ہے" "اور کوئی پاک رُوح کے بغیر نہیں کہہ سکتا کہ یسوع خداوند ہے" (۱ کرنتھیوں ۱۲ : ۳) "اگر تُو اپنی زبان سے یسوع کے خداوند ہونے کا اقرار کرے.... تو نجات پائے گا" (رومی ۱۰ : ۹) مقدس پولُس نے تو یونانی میں لکھا تھا لیکن وہ اپنی تحریرات میں کہیں کہیں بالخصوص فلسطین کی ابتدائی مسیحی جماعتوں کی جھلک دکھاتا ہے۔ جو آرامی زبان میں گفتگو کرتے اور دُعا مانگتے تھے۔ ایسے مقامات میں سے ایک مقام ۱ کرنتھیوں ۱۶ : ۲۲ ہے۔ جہاں وہ آرامی لفظ "مارانا تھا" استعمال کرتا ہے۔ جس کے معنی ہیں "ہمارے خداوند آ" اور یہ جملہ مکاشفہ کی آخری سے پہلی آیت کے ساتھ بہت ملتا ہے "آمین اے خداوند یسوع آ" (مکاشفہ ۲۲ : ۲۰)

یہ لقب "خداوند" کہاں سے آیا اور کلیسیا اُسے یسوع ناصری کے لئے کیوں اسقدر متواتر استعمال کرنے لگی؟ اس سوال سے شاید بعض قارئین حیران ہوں گے۔ کیونکہ ہم نے تو نئے عہدنامہ میں سے یہی سبق سیکھا ہے اس لئے ہمارے واسطے تو وہ ہمیشہ خداوند یسوع رہا ہے۔ اور ہم کبھی تصوّر بھی نہیں کرسکتے کہ وہ خداوند نہیں اور ہمیں بھولے سے بھی یہ خیال نہیں آتا کہ یہ لقب تحقیق طلب ہے۔ لیکن حقیقتاً یہ سوال نہایت اہم ہے اور اس پر ضخیم کتب لکھی گئی ہیں۔ لیکن ہم ان اوراق میں اختصار سے بیان کریں گے کہ یہ کیا معاملہ ہے۔

یُونانی لفظ کوری آس (KYRIOS) یعنی خُداوند کسی کو عزت سے خطاب کرنے کا لفظ ہے۔ فلپی کا داروغۂ جیل پولُس اور سیلاس کو اسی یُونانی لفظ سے خطاب کرتا ہے (کوری آئے KYRIOI) یعنی "اَے صاحبو" (اعمال ۱۶: ۳۰) لیکن یہ لفظ اس سے اعلٰے معنوں میں بھی استعمال ہوتا تھا۔ ملک میں ہر سُو یہ لقب رُومی قیصر کے لئے استعمال ہوتا تھا۔ یہودی بادشاہوں کے لئے بھی مستعمل تھا۔ علاوہ ازیں مُشرک اقوام میں بعض دیوتاؤں کے لئے یہ اعزازی لقب تھا۔ خاصکر پُر اسرار مذاہب میں جن کے بعض دیوتاؤں کے بارے میں یہ مانا جاتا تھا کہ وُہ مر گئے اور پھر جی اُٹھے۔ اُن میں سے بعض کی کہانیاں کُچھ کُچھ مسیح کی موت اور مُردوں میں سے جی اُٹھنے سے مشابہ ہیں۔ اسی سبب سے بعض علماء کا خیال ہے کہ مسیح کے لئے خُداوند کا لقب اوّل اوّل یُونانی بولنے والی غیر یہوُدی کلیسیاؤں میں رائج ہُوا۔ کیونکہ یہی لقب مسیحی ہونے سے پہلے وُہ اپنے دیوتاؤں کو دیا کرتے تھے۔ یہ خیال قابل قبول ہے کہ غیر یہوُدی مسیحیوں کے لئے اس لقب کو اختیار کر لینا آسان بات تھی کیونکہ وُہ تو پہلے ہی اُس سے مانُوس تھے۔ لیکن لفظ "مارانا تھا" بمعنی "خُداوندآ" ظاہر کرتا ہے کہ یہ لوگ اس لقب کے مُوجِد نہ تھے اور کہ مسیح آرامی بولنے والے مسیحیوں میں کسی نہ کسی معنوں میں پہلے ہی خُداوند مانا جاتا تھا جبکہ انجیل ہنوز یُونانی میں پیش نہیں کی گئی تھی۔

ہمیں یہ بھی دیکھنا ضرور ہے کہ سیپٹوآجنٹ (SEPTUAGINT) میں جو کہ عہدِ عتیق کا یُونانی ترجمہ ہے خُدا کے مقدس نام یا "دیہہ" یا "یہوواہ" کا ترجمہ (کوری آس) کیا گیا ہے۔ اور یہ ایک عجیب حقیقت ہے، کہ مسیح کے جی اُٹھنے کے فوراً بعد یُونانی بولنے والے یہوُدی جو مسیحی ہو چُکے تھے مسیح کے لئے بعینہٖ وُہی لفظ استعمال کرنے لگے جو وُہ پہلے خُدا باپ کے لئے استعمال

کرنے کے عادی تھے اور بلا شبہ اسی خیال کے ماتحت کلیسیا یسُوع کو "خُداوند" میں سے خُدا " تسلیم کرنے لگی۔ لیکن کیا وُہ مسیح کو خُداوند کہہ سکتے تھے۔ جب تک کہ اُن کا یہ ایمان نہ ہوتا کہ مسیح فی الواقع خُداوند ہے۔ جیسا کہ بعد میں کلیسیا نے نائیسین عقیدہ میں صاف صاف بیان کر دیا؟

اس حصہ میں ہم نے اپنا مطالعہ خطُوط سے شروع کیا ہے۔ کیونکہ نئے عہدنامہ میں یہ کتابیں پہلے لکھی گئیں۔ آیئے اب اناجیل کی طرف رجُوع کریں۔ یہاں ہم دیکھتے ہیں کہ صرف لُوقا ہی (جو کہ اکیلا ایک غیر یہُودی انجیل نویس ہے) یسُوع کے لئے متواتر خُداوند کا لقب استعمال کرتا ہے (لُوقا ۷ : ۱۳ و ۱۹، ۱۰ : ۱و۳۹) مسیح کو براہِ راست خُداوند کے لقب سے خطاب نہیں کیا گیا اور اگر کہیں کیا بھی گیا ہے تو وہاں اُس کے معنی صاحب یا آقا سے کچھ زیادہ نہیں۔ اناجیل سے یہ بات نکلتی ہے کہ مسیح کے لئے اُس کی زمینی خدمت کے عرصہ میں یہ لقب استعمال نہیں ہوا یا اگر ہوا بھی ہو تو بہت ہی شاذ و نادر لیکن بیشتر جی اُٹھنے کے بعد استعمال میں آنے لگا۔ پس یُوحنا کی انجیل میں ہم دیکھتے ہیں کہ پہلے انیس ابواب میں لفظ (کوری آس) بمشکل کہیں آتا ہے۔ لیکن آخری دو بابوں میں پندرہ دفعہ پایا جاتا ہے۔

کیا کوئی ثبُوت ہے کہ مسیح نے خُداوند کے لقب کو خود اپنے لئے استعمال کیا ہو یا دُوسروں کو جرأت دی ہو کہ وُہ اُس کے لئے اس لقب کو استعمال کریں؟ ایک مقام خاص اہمیت رکھتا ہے (مرقس ۱۲ : ۳۵-۳۷) میں (متی ۲۲ : ۴۱-۴۵ و لُوقا ۲۰ : ۴۱-۴۴) مسیح سوال اُٹھاتا ہے کہ "مسیح کون ہے"؟ اور یہ ظاہر کرنے کے لئے کہ مسیح کا محض داؤد کا بیٹا ہونے سے بڑھ کر ہونا ضروری ہے وُہ زبور ۱۱۰ : ۱ سے اقتباس کرتا ہے "خُداوند نے

میرے خداوند سے کہا میری دہنی طرف بیٹھ جب تک میں تیرے دشمنوں کو تیرے پاؤں کے نیچے کی چوکی نہ کردوں"۔ یہ سچ ہے کہ مسیح نے یہ نہ کہا کہ میں ہی یہ شخص ہوں جسے اس نوشتہ میں "میرا خداوند" کہا گیا ہے۔ لیکن مسیحی مان چکے تھے کہ "یسوع ہی مسیح ہے"۔ انہوں نے اس حقیقت کو یاد رکھا تھا اور باہمی تحقیق کی کہ مسیح نے اپنے حق میں زبور ۱۱۰: ۱ اقتباس کیا تھا۔ شائد یہاں ہمیں اس لقب کے آغاز کا سب سے بڑا سراغ ملتا ہے کہ اُس مسیح کے لئے جو مُردوں میں سے جی اُٹھا ہے۔ ممسوح بادشاہ ہے اور جلالی نجات دہندہ ہے مسیحیوں نے اس رواج کو کب سے شروع کیا۔

آخری بات یہ ہے کہ لقب۔ خداوند نئے عہد نامہ کے زمانہ ہی سے کلیسیا کی عبادت کے ساتھ بہت متعلق ہے۔ ابتدائی مسیحی عبادت میں بپتسمہ اور عشاء ربانی دو نمایاں جزو تھے۔ بپتسمہ کے حق میں پولس لکھتا ہے "تم خداوند یسوع مسیح کے نام سے دُھل گئے اور پاک ہوئے اور راستباز بھی ٹھہرے"۔ (۱ کرنتھی ۶: ۱۱) پاک شراکت پہلے ہی عشائے ربانی ہے (۱ کرنتھی ۱۱: ۲۰) دسترخوان خداوند کا دسترخوان ہے (۱ کرنتھی ۱۰: ۲۱) مکاشفہ میں اتوار جو ہفتہ کا پہلا دن اور یسوع کے جی اُٹھنے کا دن ہے خداوند کا دن مانا گیا ہے (مکاشفہ ۱: ۱۰) لہٰذا نہایت قدرتی بات ہے کہ ہر پشت میں کثیر التعداد مسیحیوں میں جی اُٹھا ہوا مسیح خداوند مانا جاتا ہے۔

"خدا کا بیٹا" مسیحی عقیدہ میں یسوع کو "خدا سے خدا" مانا گیا ہے۔ اور کلیسیا میں خدا باپ۔ خدا بیٹے اور خدا روح القدس کے نام میں برکت دی جاتی ہے۔ لیکن نئے عہد نامہ میں ایسے الفاظ کہیں نہیں ملتے۔ گو بلاشبہ عہدِ جدید میں مسیح کو خدا کا بیٹا کہا گیا ہے تاہم شائد

ہی اُسے کہیں براہِ راست خُدا کہا گیا ہو۔ صرف ایک یا دو مستثنیٰ مقامات ہیں۔ پہلا (رومی ۹ : ۵) "اور جسم کے رُو سے مسیح بھی اُن ہی میں سے ہُوا جو سب کے اُوپر اور ابد تک خُدائے محمُود ہے"۔ لیکن یُونانی زبان کی یہ آیت یُوں بھی ترجمہ کی جا سکتی ہے "مسیح بھی اُن ہی میں سے ہُوا اور خُدا جو سب کے اوپر ہے اُسی کی ابد تک حمد ہوتی رہے"۔ بہت سے علماء کا خیال ہے کہ مؤخر الذکر ترجمہ صحیح ہے۔ پھر طِطُس ۲ : ۱۳ میں بھی یہ بات پیچیدہ ہے۔ کہ آیا یُونانی آیت کا ترجمہ "بزرگ خُدا (خُدا باپ) اور ہمارا مُنجی یسُوع مسیح" ہونا چاہیئے یا "بزرگ خُدا اور مُنجی یسُوع مسیح"۔ شاید عہدِ جدید کے مصنّفین کے لئے جو کہ بیشتر یہودی تھے یہ قُدرتی بات تھی کہ وُہ یسُوع مسیح کو خُدا کہنے سے ہچکچاتے تھے کیونکہ وُہ لفظ خُدا اُسی کے لئے استعمال کرنے کے عادی تھے جسے ہم خُدا باپ کہتے ہیں۔ لیکن اس میں بھی قطعاً کوئی شک نہیں کہ وُہ یہ بھی یقین رکھتے تھے کہ یسُوع کا خُدا کے ساتھ ایک ایسا خاص رشتہ ہے جو اور کسی انسان کا نہیں ہو سکتا ورنہ مُقدس پولُس رسُول کیسے اکٹھا کہہ سکتا تھا "خُداوند یسُوع مسیح کا فضل۔ خُدا کی محبت اور رُوح القُدس کی شراکت"۔ (۲ کرنتھیوں ۱۳ : ۱۴) اور وُہ لقب جس کے وسیلہ سے وُہ سب سے زیادہ موزوں طور سے خُدا اور یسُوع کے بین رشتہ ظاہر کرتے تھے "خُدا کا بیٹا" تھا۔

کلیسیا کا اس لقب کو ابتداء ہی سے اختیار کر لینا ایک قُدرتی بات تھی اور مسیح کی زبان پر بھی سب سے زیادہ یہی الفاظ رہے "باپ"۔ "میرا باپ" وغیرہ ہم اس سے پہلے بھی مسیح کا بڑا فرمان اقتباس کر چکے ہیں۔ "بیٹے کو کوئی نہیں جانتا سوائے باپ کے" (متّی ۱۱ : ۲۷) مرقس ہمیں بتاتا ہے کہ گتسمنی باغ میں یسُوع خُدا کو ابّا یعنی اَے باپ کہکر پُکارتا ہے (۱۴ : ۳۶) لُوقا یہ اضافہ کرتا

ہے کہ صلیب پر پہلے اور آخری کلمے میں بھی یہی خطاب موجود ہے "اے باپ اُنہیں معاف کر کیونکہ یہ نہیں جانتے کہ کیا کرتے ہیں" اور "اے باپ میں اپنی رُوح تیرے ہاتھ میں سونپتا ہوں" (لوقا ۲۳: ۳۴ و ۴۶) لیکن اگرچہ مسیح نے اپنے شاگردوں کو "اے ہمارے باپ" کہہ کر دُعا مانگنا سکھایا اور اُن کو حکم دیا "کامل ہو جیسا تمہارا باپ کامل ہے" (متی ۵: ۴۸) تاہم اُس نے کبھی نہیں کہا کہ تم بھی انہیں معنوں میں خُدا کے بیٹے ہو جن معنوں میں کہ میں بیٹا ہوں۔

تمام اناجیل میں باپ اور بیٹے کے رُوحانی اور اخلاقی رشتہ پر زور دیا گیا ہے اور یہی بات چوتھی انجیل میں تین سُرخیوں کے ماتحت بالکل واضح کر دی گئی ہے۔

(۱) بلحاظ علم:- "میں اُسے جانتا ہوں اور اگر کہوں کہ اُسے نہیں جانتا تو تمہاری طرح جھوٹا بنوں گا مگر میں اُسے جانتا ہوں اور اُس کے کلام پر عمل کرتا ہوں (یوحنا ۸: ۵۵)

(۲) بلحاظ فرمانبرداری:- "میں اپنے اختیار سے کچھ نہیں کرتا لیکن جو میں نے باپ سے سُنا وُہی دُنیا سے کہتا ہوں" "پس جو کچھ میں کہتا ہوں جس طرح باپ نے مجھ سے فرمایا ہے، اُسی طرح کہتا ہوں" (یوحنا ۸: ۲۸ و ۱۲: ۵۰)

(۳) بلحاظ تعاون:- "میرا کھانا یہ ہے کہ اپنے بھیجنے والے کی مرضی کے موافق عمل کروں اور اُس کا کام پورا کروں" (یوحنا ۸: ۳۴)

ہم اس امر کا تذکرہ کر چکے ہیں کہ ابتدائی مسیحی "خُدا کا بیٹا" کے لقب کو خُدا اور مسیح کے درمیان جو خاص رشتہ ہے اُسے ظاہر کرنے کے لئے استعمال کرتے تھے۔ پھر بھی یہ لقب نئے عہدنامہ میں اتنا عام نہیں ہے جتنا کہ اُمید کی جا سکتی ہے۔ بعض کتابوں میں مثلاً یعقوب اور پطرس کے پہلے خط میں یہ لقب بالکل نہیں پایا جاتا۔ مکاشفہ کی کتاب میں یہ لفظ صرف ایکدفعہ مستعمل ہے "خُدا کا

بیٹا فرماتا ہے" (مکاشفہ ۲: ۱۸) اعمال کی کتاب میں دو بار مذکور ہے اور ان میں سے ایک تو زبور ۲: ۷ سے اقتباس ہے۔ اس کتاب کی ابتدائی تقاریر میں یہ لقب کہیں نہیں آیا جن میں لوقا بتاتا ہے کہ رسول کس طرح کوشش کرتے تھے کہ خود بھی اور دوسروں کو بھی سمجھائیں کہ آدمیوں کی زندگی میں مُردوں میں سے جی اُٹھے ہوئے مسیح کے کیا معنی ہیں۔ مقدس پولُس ہی نے اپنی رُوحانی تبدیلی کے بعد عبادت خانوں میں یسُوع کی یہ کہکر منادی کی "وُہ خُدا کا بیٹا ہے" (اعمال ۹: ۲۰) عبرانیوں کے خط کا مُصنف انبیاء اور بیٹے میں نمایاں فرق بیان کرتا ہے۔ کہ بیٹا فرشتوں سے بھی عالی مرتبہ ہے "اگلے زمانہ میں خُدا نے ہمارے باپ دادوں سے نبیوں کی معرفت کلام کیا لیکن اس آخری زمانہ میں ہم سے بیٹے کی معرفت کلام کیا" (عبرانی ۱: ۱-۲) لیکن سب مصنفین سے بڑھ کر مقدس پولُس مسیح پر بحیثیت خُدا کے بیٹے کے ایمان لانے کی تلقین کرتا ہے۔ اور اُس کے اپنے ایمان کی بنیاد بھی یہی تھی۔ "خُدا کا بیٹا جس نے مُجھ سے محبت رکھی اور اپنے آپ کو میرے لئے موت کے حوالہ کر دیا" (گلتی ۲: ۲۰) "خُدا کے بیٹے یسُوع مسیح کی منادی ہم نے تُم میں کی" (۲ کرنتھی ۱: ۱۹) "اور ہمارے بلائے جانیکا مقصد یہ ہے کہ ہم اُس کے بیٹے کے ہمشکل ہوں تاکہ وُہ بہت سے بھائیوں میں پہلوٹھا ٹھہرے" (رومی ۸: ۲۹)

تاہم یہ لقب بھی کچھ ایسا کامل نہ تھا کہ وُہ یسُوع مسیح کے بارے میں مسیحیوں کے مافی الضمیر کو پُورا پُورا ظاہر کر سکے مسیحیوں نے لقب "خُدا کا بیٹا" پُرانے عہدنامہ میں دیکھا اور قدرتی طور پر وُہ ایسے الفاظ کا اطلاق مسیح پر کرنے لگے جو کہ زبور ۲: ۷ میں پائے جاتے ہیں "تُو میرا بیٹا ہے آج تُو مُجھ سے پیدا ہُوا" اِس سے معلُوم ہوتا ہے کہ جسمانی بادشاہ سے بڑھ کر کوئی آسمانی

بادشاہ آنے والا تھا۔ دقت یہ تھی کہ عہدِ عتیق میں یہ محاورہ "خدا کا بیٹا" بہت سے لوگوں کے لئے استعمال ہوتا تھا۔ مثلاً اسرائیل کے لئے "اسرائیل میرا پہلوٹھا بیٹا ہے"۔ (خروج ۴ : ۲۲) اسرائیل کے بادشاہ کے لئے "میں اُس کا باپ ہوں گا اور وہ میرا بیٹا ہوگا"۔ (۲ سیموایل ۷ : ۱۴) فرشتوں کے لئے "جب صبح کے ستارے مل کر گاتے تھے اور خدا کے سب بیٹے خوشی سے للکارتے تھے"۔ (ایوب ۳۸ : ۷) پس یہ لقب کسی بھی آسمانی شخص یا کسی ایسے فرد اور گروہ کے لئے استعمال ہو سکتا تھا جو خدا کے ساتھ قریبی رشتہ رکھتا ہو۔ لیکن خدا کے اِس بیٹے اور دیگر بیٹوں میں کیا رشتہ تھا اور مسیح کب خدا کا بیٹا بنا؟ کیا پیدائش کے وقت بیٹا بنا یا بپتسمہ کے وقت جب آسمان سے یہ آواز آئی "تو میرا پیارا بیٹا ہے"۔ (مرقس ۱ : ۱۱) یا کیا مُردوں میں سے جی اُٹھنے پر جبکہ وہ داؤد کی نسل سے پیدا ہو کر قدرت سے خدا کا بیٹا ٹھہرا؟ (رومی ۱ : ۴) یا کیا اُس کی ابنیت دیگر ابنیتوں سے قدیم تھی یعنی ابدی تھی؟ شائد ایسے ہی سوالات نے نئے عہد نامہ کے ایک مصنف کو یہ بڑا لقب استعمال کرنے پر آمادہ کیا جس پر اب آخر میں ہم غور و خوض کریں گے۔

لفظ "کلام" مسیحی لوگ اس امر کے معتقد تھے کہ مسیح زندہ ہے جو کہتا ہے کہ "میں زندہ ہوں میں مر گیا تھا اور دیکھو ابدالآباد زندہ رہوں گا"۔ (مکاشفہ ۱ : ۱۸) اُس کی زندگی کی آخرت کیا اُس کی زندگی کا آغاز ہے؟ اس کا جواب مقدس پولس چند الفاظ میں ہی نہیں دیتا وہ نہایت وضاحت سے اشارہ کرتا ہے کہ خدا کا بیٹا دنیا میں آنے سے پہلے خدا کے ساتھ تھا۔ "کیونکہ تم ہمارے خداوند یسوع مسیح کے فضل کو جانتے ہو کہ وہ اگرچہ دولتمند تھا مگر تمہاری خاطر غریب بن گیا تاکہ تم اُس کی غریبی کے سبب سے دولتمند ہو

جاؤ۔" (۲ کرنتھی ۸: ۹) "اُس نے اپنے آپ کو خالی کر دیا اور خادم کی صورت اختیار کی۔" (فلپی ۲: ۷) اب سوال اُٹھتا ہے کہ وُہ کب دولت مند تھا؟ کس چیز سے اُس نے اپنے آپ کو خالی کر دیا؟ یقیناً یہ دونو آیات اُس جلال کی طرف اشارہ کرتی ہیں جو وُہ بنائے عالم سے پیشتر باپ کے ساتھ رکھتا تھا۔ (یُوحنّا ۱۷: ۵) لیکن چوتھی انجیل کے مصنّف نے یسُوع اور باپ کے ابدی رشتہ کو ظاہر کرنے کے لئے ایک موزُوں جُملہ ڈھونڈ پایا۔ جیسے وُہ یُوں ادا کرتا ہے "کلام مجسّم ہُوا" (یُوحنّا ۱: ۱۴) "ابتدا میں کلام تھا۔ کلام خُدا کے ساتھ تھا اور کلام خُدا تھا اور کلام مجسّم ہُوا اور فضل اور سچّائی سے معمُور ہو کر ہمارے درمیان رہا۔" (یُوحنّا ۱: ۱ و ۱۴) یہ خیال چوتھی انجیل کی افتتاحی آیات میں قلمبند ہے۔ جُملہ سارے نئے عہدنامہ میں صرف ایک بار آتا ہے۔ "اور اُس کا نام کلامِ خُدا کہلاتا ہے۔" (مکاشفہ ۱۹: ۱۳، لیکن اس کے ساتھ ہی ملاحظہ فرمائیں، ا یُوحنّا ۱: ۱۔۴)

اِس عجیب لقب "لوگاس (LOGOS) یعنی کلام کا کیا مطلب ہے؟ عہدِ عتیق میں خُدا کے کلام کے معنی ہیں "خُدا کی قُدرت برسرِکار" چنانچہ خُدا کے تخلیقی کام کے باب میں یہ محاورہ بار بار استعمال ہُوا ہے۔ "اور خُدا نے کہا روشنی ہو جا" (پیدائش ۱: ۳) "آسمان خُدا کے کلام سے اور اُس کا سارا لشکر اُس کے مُنہ کے دم سے بنا۔" (زبور ۳۳: ۶) بعینہٖ یہی خیال انجیل میں بھی ہے۔ "سب چیزیں اُس کے وسیلہ سے پیدا ہوئیں اور جو کچھ پیدا ہُوا اُس میں سے کوئی چیز بھی اُس کے بغیر پیدا نہیں ہُوئی۔" (یُوحنّا ۱: ۳)

لیکن لفظ "لوگاس" یعنی کلام کی یُونانیوں اور یہُودیوں میں ایک طویل داستان ہے۔ اور وہاں اُس کے معنی صرف کلام ہی نہیں بلکہ انسان ہیں

اصُولِ قوّت مُدرکہ اور عالم میں اسلُوبِ ترتیب اور اصُولِ تناسب جو دُنیا کو بطور ایک واحد چیز متوازن تھامے ہوُئے ہے ۔ یہ اغلب ہے کہ چوتھی انجیل کا مصنّف یُونانیوں اور یہوُدیوں کے لئے انجیل شریف لکھتے ہوُئے یہ دونو خیال اپنے دل میں رکھتا ہے ۔

لیکن اس لفظ کے استعمال سے وُہ ہمیں خُدا کے بارے میں کیا بتانے کی کوشش کر رہا ہے ؟ یہ کہ خُدا پاک اپنا ذاتی ظہُور ہم پہ ظاہر کرتا ہے "خُدا کو کبھی کسی نے نہیں دیکھا، اکلوتے بیٹے نے اُسے ظاہر کیا"۔ (یُوحنّا ۱ : ۱۸)، جب تک کہ خُدا اپنے آپ کو ظاہر نہ کرنا چاہے ہم اُسے ہرگز نہیں جان سکتے ۔ بائبل پہلے صفحہ سے آخری صفحہ تک بتاتی ہے کہ خُدا ایسا خُدا ہے جو اپنے آپ کو ظاہر کرنا چاہتا ہے ۔ اور وُہ ایسا خُدا ہے جسے ہم جان سکتے ہیں ۔ جب مَیں خلوُصِ دل کے ساتھ کلام کرتا ہوُں تو میرا کلام مجھے آپ پر تمام تر واضح کر دیتا ہے اور آپ کو معلُوم ہو جاتا ہے کہ مَیں کیا ہوُں ۔ اسی طرح خُدا بھی اپنے آپ کو اپنے کلام کے وسیلہ سے ظاہر کرتا ہے ۔ یہاں اُن چودہ عجیب و غریب آیات میں ہمیں اُن طریقوں کا ایک مختصر سا خاکہ دیا گیا ہے جن میں خُدا اپنے آپ کو ظاہر کرتا ہے تخلیقِ عالم میں اُس کا ظہُور ہے ۔ اُس نے ساری چیزیں بڑی اچھی بنائیں (پیدائش ۱ : ۴) اور تمام چیزیں اُس کا جلال منعکس کرتی ہیں ۔ "آسمان خُداوند کا جلال ظاہر کرتے ہیں" (زبُور ۱۹ : ۱) کلامِ الٰہی مخلوقات کی صوُرتوں میں ظاہر کیا گیا ہے اُس نے زندہ چیزیں تخلیق کی ہیں اور اُن چیزوں میں سے انسان کو ادراک بخشا ہے "زندگی آدمیوں کا نُور تھی"۔ (یُوحنّا ۱ : ۴)۔ "آدمی کی رُوح خُدا کا چراغ ہے" (امثال ۲۰ : ۲۷) کلامِ خُدا انسانی شعوُر میں منعکس ہوتا ہے ۔ اُس نے ایک خاص قوم کو چُنا تھا اور اُس قوم

کے پاس انبیاء بھیجے تھے کہ اُنہیں سکھائیں اور مطلع کریں وُہ ایک آدمی یُوحنّا نام آموجُود ہُوا جو خُدا کی طرف سے بھیجا گیا تھا" (یُوحنّا ۱: ۶) کلامِ خُدا اِنسانی الفاظ میں ظاہر ہُوا ۔ اور آخری صُورت میں کلام اپنی ساری معمُوری سمیت خُود اِنسانی شکل ۔ شعُور ۔ تقریر اختیار کر کے آدمیوں کے درمیان رہنے کے لئے آیا ۔ تاکہ آدمی اُسے دیکھ سکیں ۔ سُن سکیں ۔ چھُو سکیں ۔ جان سکیں اور ایمان لا سکیں اور اُس کی معمُوری میں سے معمُوری حاصل کریں "وُہ اور کلام مجسّم ہُوا اور ہمارے درمیان رہا ... اور ہم نے اُس کا جلال دیکھا" (یُوحنّا ۱: ۱۴) کلام اپنے آپ کو ظاہر کرنے کے لئے اور کیا کر سکتا تھا ؟

کون سا مظہر خُدا کو پُورے طور سے ظاہر کر سکتا ہے ؟ ماننا پڑیگا کہ صرف خُدا ہی خُدا کو ظاہر کر سکتا ہے ۔ صرف میرا کلام ہی مجھے پُورے طور پہ ظاہر کر سکتا ہے ۔ اگر میں نیک نیتی سے کلام کروں تو میرا کلام میرا پُورا پُورا انکشاف کریگا میں اور میرا کلام ایک ہیں ۔ اسی طرح خُدا اور خُدا کا کلام ایک ہیں "وُہ اور کلام خُدا تھا" (یُوحنّا ۱: ۱) پس اگر کلام خُدا ہے اور اگر وُہ کلام آدمیوں میں خُدا کا کامل ظہور ہے اور اگر وُہی کلام خُداوند یسُوع مسیح میں مجسّم ہُوا تو قدم بقدم ہم اِس نتیجے پر پہنچتے ہیں کہ جو مسیح میں ظاہر ہُوا وُہ تھا جو ابتداء سے خُدا کے ساتھ تھا گو اُس کے تجسّم کا ایک وقت ہے لیکن جو مجسّم ہُوا وُہ تھا جو ابد سے تھا ۔ (یُوحنّا ۱: ۱)

یہی سبب ہے کہ عہدِ جدید کے زمانہ ہی سے کلیسیا میں تُوما کے الفاظ گُونجتے چلے آ رہے ہیں "اَے میرے خُداوند اَے میرے خُدا" (یُوحنّا ۲۰: ۲۸) اب ہم دیکھتے ہیں کہ عقیدہ کے یہ الفاظ "خُدا میں سے خُدا" جو پہلے تو بہت پیچیدہ نظر آتے تھے لیکن اب معلُوم ہوتا ہے کہ ان الفاظ

کا مسیحیوں کے اظہار الایمان کا ایک حصّہ ہونا نہایت ضروری ہے، تاکہ ہم عہدِ جدید کی تعلیم کو صحیح صحیح مان سکیں ۔

پانچواں باب

غور و خوض!

ہم اس مرحلے پہ پہنچ گئے ہیں کہ ہم نے نئے عہد نامہ کی شہادت کا مختصر سا مطالعہ ختم کر لیا ہے ہم نے عہدِ جدید کے مصنفین میں اُن اشخاص کو دیکھا ہے جن کے اندر ایک عجیب و غریب تجربہ کی بِنا پہ ایک تحریک پیدا ہوئی اور ہم نے یہ بھی دیکھا ہے کہ اس واقعہ کے حق میں جو رونما ہوا اُن سب کی شہادت میں ایک خاص مطابقت ہے یعنی خُدا نے ایک عمل کیا۔ ربنا المسیح آیا، مُوا۔ مُردوں میں سے جی اُٹھا۔ پاک رُوح بھیجا گیا۔ وُہ جانتے تھے کہ اس سارے انتظام کے وسیلہ سے وُہ آزاد کئے گئے ہیں۔ وُہ اس آزادی میں بہت خوش تھے اور ایک دوسرے سے اس طرح پیار کرنے لگے کہ انہیں لفظ محبّت کے نئے معنی نظر آنے لگے۔ لیکن ہر مصنف نے اپنے تجربہ کو بیان کرنے کے لئے اپنی ہی پسند کے الفاظ منتخب کئے! اِن سب مصنفین کی خوشی اسی بات میں تھی کہ یسُوع کو خُداوند کہیں۔ لیکن پولُس رسُول نے یسُوع کے لئے لقب "خُدا

کا بیٹا" دُوسروں سے زیادہ استعمال کیا۔ عبرانیوں کے خط کا مصنف واحد طور سے ایسا شخص ہے جو مسیح کے کام کو سردار کاہن کے کام کے طور پر بیان کرتا ہے۔ مکاشفہ کی کتاب کا مصنف سب سے زیادہ خُدا کے برّے کا محاورہ استعمال کرتا ہے۔ لیکن چُونکہ سب کا ایمان اور تجربہ ایک ہی تھا اور سب ایک ہی پاک رُوح کی ہدایت اور اثر کے ماتحت تھے اس لئے القاب اور الفاظ کا اختلاف باعثِ دِقت نہ ہُوا۔

لیکن جلد ہی وہ وقت آگیا جبکہ لوگ نئے نئے سوال پُوچھنے لگے اور مُختلف جوابات کی بنا پر جو مُختلف لوگوں نے اس موضوع پر دیئے کلیسیا میں اختلاف ہونے لگا۔ کئی سوالوں کے جوابات کتابِ مقدّس میں صاف طور پر نہیں ملتے اور یہ شاید اس لئے ہے کہ اُن سوالوں کی نوعیت جدید قسم کی تھی۔ ابتدائی مسیحی یا تو یہودیوں میں سے تھے یا ایسے غیر یہودی تھے جو عہدِ عتیق کی تعلیمات سے متاثر تھے۔ لیکن جلد ہی بہت سے لوگ ایسے بے دین فرقوں میں سے مسیحی ہُوئے جو دینِ اسرائیل کے متعلّق کچھ نہیں جانتے تھے۔ اُن کے سبب سے بہت سے مسائل پیدا ہو گئے۔ خاص طور پر یُونانی سوال کرنے کے بڑے عادی تھے اور طبعاً سوال پُوچھنے کے شوقین تھے۔ سوال پُوچھنے میں کوئی مضائقہ نہیں بلکہ اس سے ہم سچّائی یا حقیقت کے گہرے علم تک پہنچتے ہیں۔

اگر لوگ صبر و تحمّل سے کام لیتے تو شاید وہ مجموعی طور سے حقیقت کی تہ تک پہنچ جاتے لیکن بعض لوگوں کے پیش کردہ جوابات کے بارے میں کلیسیا کو یہ اعلان کرنا پڑا کہ اگر اُن کے جوابات کو بجا تسلیم کر لیا جائے تو مسیحی ایمان کی بنیاد تباہ ہو جائے گی اور بعض جوابات کے حق میں یہ کہنا پڑا کہ اُن سے ایمان

کے توازن میں فرق آتا ہے۔ یا بہت سی ایسی باتیں ہیں جو ایمان کا ضروری حصہ ہیں مخفی رہ جاتی ہیں۔ لہٰذا وہ جوابات ادھورے قرار دیئے گئے۔ بدقسمتی یہی تھی کہ ایک دوسرے کی برداشت نہ کی گئی اور جب اختلاف پڑ گیا تو ہر ایک کے لئے آسان تھا کہ دوسرے کو ایمان کا دشمن کہہ سکے اور اس سے اگلا قدم یہ تھا اور یہ کہا گیا کہ جو ایمان کے بارے میں غلطی کرے وہ بُرا آدمی (شیطان) ہے۔ اور سب سے بُری بات یہ ہوتی کہ بدعتی کو حکومت کی مدد سے ملک بدر کیا جاتا تھا یا جیل میں ڈالا جاتا تھا اور ان سے بھی بُرے ایام میں وہ قتل بھی کروا دیا جاتا تھا۔ چنانچہ اُس زمانہ کی کلیسیائی تواریخ میں بہت سی افسوسناک اور شرمناک باتیں پائی جاتی ہیں، لیکن بہت سی باتیں حوصلہ افزا بھی ہیں جیسا کہ ہم دیکھتے ہیں پاک رُوح نے کلیسیا کو مایوس نہ ہونے دیا کیونکہ جنھوں نے اُس کی آواز کو سُنا اُنہیں اُس نے یسُوع مسیح کی حقیقت اور سچائی کی اور زیادہ سمجھ بخشی۔

اس کتاب میں ہمارا ہرگز یہ مقصد نہیں کہ کلیسیا کی پہلی پانچ صدیوں کی تواریخ بیان کریں، ہم تو صرف اُن سوالات پر غور کریں گے جو لوگ مسیح کے بارے میں پوچھتے تھے اور اُن جوابات پر تبصرہ کریں گے جنہیں کلیسیا نے غلط کہہ کر ردّ کر دیا تھا اور پھر ان جوابات پر غور و خوض کریں گے جنکو کلیسیا نے رفتہ رفتہ مسیح کی فطرت اور ہستی کے بارے میں صحیح سمجھ کر قبول کر لیا۔ معلوم ہوتا ہے کہ پہلی چار صدیوں سے کچھ زیادہ عرصہ میں ہی سب سوالات پوچھے اور سوچے گئے مگر وہ شائد آج ہمارے لئے ہمارے خیال سے بڑھکر اہم اور ضروری ہیں۔ اور چونکہ تاریخی واقعات ایک ہی رنگ میں پیش نہیں ہوتے اور کئی پُرانے سوالات جو آج بھی سر اُٹھاتے ہیں، اور پُرانے شکوک نئے رنگ

میں ظاہر ہوتے ہیں، اور شائد یہ معلوم کر کے کہ پہلی صدیوں کی کلیسیا نے اُن مشکلات کا سامنا کیسے کیا ہمیں اس بیسویں صدی میں گواہی دینے میں مدد ملے۔
اس مبحث پر وُہ سوالات تین بڑی اقسام کے تحت ہمارے سامنے آتے ہیں، جو یکے بعد دیگرے کلیسیا کی تواریخ میں ظاہر ہوتے رہے۔
(۱) وُہ سوالات جو خُدا کی فطرت (NATURE) اور دُنیا کے ساتھ خُدا کے تعلقات سے متعلق ہیں۔
(۲) وُہ سوالات جو ذات اِلٰہی (GODHEAD) سے متعلق ہیں کہ ہم مسیح کو خُدا کیسے مان سکتے ہیں تاکہ ہم دو خُداؤں کو ماننے کے خیال سے بھی بچ جائیں۔
(۳) سوالات کی وُہ قسم جو مسیح کے بیک وقت خُدا اور انسان ہونے سے متعلق ہیں۔

خُدا اور دُنیا :- ہمارے سامنے یہ سوال درپیش ہے کہ خُدا کیسا ہے؟ قدیم دُنیا کے بہت سے لوگ یہ جواب دیتے تھے کہ خُدا ازلی ہے۔ اس لئے وُہ لازوال اور لا مبدل ہے اور چونکہ دُکھ اُٹھانا ایک تبدیلی ہے لہٰذا خُدا کے بارے میں یہ خیال ممکن نہیں کہ وُہ کسی بھی صُورت سے دُکھ اُٹھائے۔ اب اگر ہم اپنے دل میں یہ خیال رکھتے ہُوئے یسُوع مسیح پر غور کریں تو یقیناً مندرجہ ذیل دو نتائج میں سے ایک ہمیں لازماً ماننا پڑے گا۔
(۱) چونکہ مسیح نے دُکھ اُٹھایا لہٰذا وُہ اُلوہیّت کا مُدعی نہیں ہو سکتا۔
(۲) چونکہ مسیح میں اُلوہیّت تھی لہٰذا وُہ دُکھ نہیں اُٹھا سکتا تھا۔
اور حقیقت یہ ہے کہ ابتدائی کلیسیا میں مختلف گروہ ایسے متضاد نتائج پر پہنچے اور ہمیشہ کلیسیا کی تواریخ میں پیچیدگیاں قائم رہیں۔
(۱) وُہ فرقہ جو اس خیال کا معتقد تھا کہ دُکھ اُٹھانے والا یسُوع اُلوہیّت کا

مُدعی نہیں ہوسکتا ابی اونائیٹس (EBIONITES) کہلانے لگا۔ اس لفظ کے معنی ہیں غریب لوگ یا غریب آدمی ہاور وُہ لوگ جو اس طبقہ کے لوگوں سے متفق الرائے نہ تھے اُن کو شائد یہ نام اس لئے دیتے تھے کیونکہ وُہ شخصیت مسیح کے حق میں ناقص تعلیم رکھتے تھے۔ اِس فرقہ کے لوگ بیشتر فلسطین اور شام کے یہودی مسیحی تھے اور یہ فرقہ کئی صدیاں قائم رہا، لیکن کلیسیا جامع پراثر انداز نہ ہو سکا۔

(۲)، لیکن دُوسرے خیال کے لوگوں کا جو مسیح کی اُلوہیت کے قائل تھے اور اس بات کو مانتے تھے کہ اُس کا دُکھ اُٹھانا ناممکن تھا، زیادہ اثر پذیر ہوا۔

پھر یہ لوگ انجیل کے بیانات کی کیا تشریح کرتے تھے اور بالخصوص مسیح کے صلیبی دُکھوں کی جو انجیل میں مرقوم ہیں؟

ایک جماعت تو اس کا یہ جواب دیتی ہے کہ مسیح کا جسم ہمارے جسم کی مانند حقیقی نہ تھا بلکہ محض ایک دکھاوا تھا، اور معلوم ہوتا ہے کہ کلیسیا میں یہ خیالات ابتدائی زمانہ ہی سے شروع ہو گئے تھے کیونکہ مقدس یوحنا اپنے پہلے خط میں لکھتے ہوئے انہیں خیالات کی تردید کرتا ہے "خدا کے رُوح کو تم اس طرح پہچان سکتے ہو کہ جو کوئی رُوح اقرار کرے کہ یسوع مسیح مجسم ہو کر آیا ہے وُہ خدا کیطرف سے ہے، اور جو کوئی رُوح یسوع کا اقرار نہ کرے وُہ خدا کیطرف سے نہیں! اور یہی مخالف مسیح کی رُوح ہے"۔ (یوحنا ۴: ۲-۳) مؤخر الذکر فرقہ کا نام ڈوکیٹسٹ (DOCETISTS) تھا۔ یہ یُونانی لفظ ڈیکئی (DEKEI) سے مشتق ہے اور اسکے معنی ہیں "معلوم ہونا یا ظاہر ہوتا ہے"۔ حقیقت میں وُہ مسیح کی عقیدت اور عزت کے سبب سے مادی دُنیا سے اُس کے حقیقی تعلقات کا انکار کرتے تھے۔ لیکن کلیسیا نے مجموعی طور پر یہ جلد ہی بھانپ لیا کہ محض فریب نظر ہستی کی مہیا کردہ نجات حقیقی انسانوں کے لئے کچھ حقیقت نہیں

رکھتی۔ چنانچہ انطاکیہ کے شہید بشپ اگناشئیس (IGNATIUS سنہ ۱۱۰ء) نے اُن کے متعلق یُوں لکھا ہے۔ "یہ غلط ہے جیسا کہ بعض بے ایمان کہتے ہیں کہ مسیح کے دُکھ محض فریبِ نظر تھے۔ حقیقت یہ ہے کہ وُہ خُود دکھا وا ہیں اور جیسا وُہ سمجھتے ہیں ویسا ہی اُن کے لئے ہوگا!"

ایک اور بڑا گروہ یہ مانتا تھا کہ مادہ فی ذاتہٖ ناقص ہے۔ اور یہ ایک ایسا خیال ہے جو بہت سے مشرقی مذاہب میں پایا جاتا ہے۔ اس گروہ میں کئی مختلف خیالات تھے مگر اکثریت مندرجہ ذیل باتوں پر متفق تھی :۔

کہ انسانی رُوح الٰہی رُوح کا چھوٹا سا پارہ ہے۔ جو کسی طرح گمراہ ہو کر اس ناقص دُنیا میں مقیّد ہوگیا ہے۔ اب یہ کیسے آزاد کیا جا سکتا ہے؟ صرف خاص مخفی معرفت کے وسیلے سے۔ پس اس خیال کے ماننے والوں کو ناسٹک کا نام دیا جانے لگا (یہ یُونانی لفظ گناسس (GNOSIS بمعنی علم سے مشتق ہے) یہ مخفی علم انسان کو کیسے حاصل ہو سکتا ہے؟ اس کا جواب وُہ یُوں دیتے تھے کہ خُدا نے اپنے پہلوٹھے "شعُور" یا "کلام" کو بھیجا تا کہ وُہ اُن کی عقلوں کو روشن کرے جو بچ سکتے ہیں۔ یہ کلام ایک شخص بنام لیسُوع میں اُس کے بپتسمہ کے وقت داخل ہُوا اور صلیب سے پہلے اُس میں سے نکل گیا۔ اس طرح سے صرف انسانی نیچر ہی مصلُوب ہُوئی اور کہ صلیب کے ساتھ الٰہی نیچر کا کچھ واسطہ نہ تھا۔ اس شخص لیسُوع کا جسم مُردوں میں سے جی نہیں اُٹھا تھا۔ الٰہی مسیح یعنی کلام اُس علم کے وسیلہ سے جو وُہ آدمیوں کو بخشتا ہے اُنہیں بیدار کر کے آسمانی بادشاہت میں لے جاتا ہے، جو کہ اُن کا حقیقی مقام ہے۔

بہت سی اس قسم کی تعلیم موجُودہ دُنیا میں بھی رائج ہے۔ بہت سے لوگ سمجھتے ہیں کہ دُنیا میں بیشتر مصائب و تکلیفات لاعلمی کے سبب سے ہیں اور اگر

لوگ علم کی روشنی سے منوّر ہوتے تو یہ تمام چیزیں دُور و کافور ہو جاتیں۔ ضرورت ہے کہ انسان گناہ اور لاعلمی سے مخلصی پائے۔ ان لوگوں کے مطابق گناہ دل میں نہیں بلکہ ارادہ میں رہتا ہے، اور ضروری ہے کہ انسان تمام تر نیا بنایا جائے اور اس کے لئے صرف دل ہی کا منوّر ہو جانا کافی نہیں لہٰذا اس تعلیم سے تجسّم کا سارا اصُول کہ کلام مجسّم ہُوا خطرے میں تھا۔

کلیسیا نے ایسی تعلیمات (عقائد) کا کیا جواب دیا جن کے زیرِ اثر دُوسری صدی عیسوی میں بہت سے مسیحی گمراہ ہو گئے ؟ کلیسیا نے آخری اور روائتی جواب یہ دیا کہ چاروں اناجیل کو پاک نوشتوں میں ہمیشہ کے لئے داخل کر دیا، جن سے عہدِ جدید کی ابتدا و افتتاح ہوتی ہے۔ ربنا المسیح یسُوع کی زندگی کے سچے اور تواریخی حقائق اور اُس کی زندگی عوام الناس میں جو اس صفحہ ہستی پر بستے ہیں ایک انسان کامل کی زندگی تھی اور اُن اوہام کے مقابلے میں جو اُس کی ذات کا مطلب کچھ اور بتاتے تھے، ایک آخری دندان شکن جواب تھا۔ تسلیم بالیقین کیا کہ اُس میں اُلوہیت ہے اور اُس نے دُکھ اُٹھایا۔ وُہ خُدائے معلّیٰ مالکِ دو جہاں کا کلام ہے اور وُہ مجسّم ہُوا۔ لیکن اس جواب سے سارے سوالات حل نہ ہو سکے۔ ہنُوز کئی اور باتوں پر غور کرنے کی ضرورت رہ گئی لیکن بعض جوابات جنہیں دینا ممکن تھا غلط معلوم ہونے لگے۔ کیونکہ ناسٹک مسیحی ———
(GNOSTIC CHRISTIAN) اپنے ہی اصُولات کے مطابق نئے عہدنامہ کے مکاشفہ پر پُورا نہیں اُتر سکتا تھا۔

الٰہی فطرت :- اگر ہم مسیح کی اُلوہیت کو مان لیں تو پھر ہم کیسے کہہ سکتے ہیں کہ خُدا واحد ہے۔ اور یہی وُہ سوال ہے جو اہلِ اسلام آج ہم سے پُوچھتے ہیں۔ ابتدائی صدیوں میں یہودی مخالف مسیحیوں سے یہی سوال پُوچھا کرتے تھے۔

ہم اس مقام پر تین بے ریا مخلصانہ جوابات بیان کرنے کی کوشش کریں گے جو کہ اس موضوع کے متعلق تیسری اور چوتھی صدی عیسوی میں پیش کئے گئے لیکن کلیسیائے جامع نے ان جوابات کو درست اور بجا تسلیم نہ کیا۔

۱۔ اس ضمن میں پہلا جواب ساموساٹہ کے پولس (PAUL OF SAMOSATA) نے پیش کیا جو کہ ۲۶۰ء میں انطاکیہ کا بشپ بنا۔ اس نے یہ تعلیم دی کہ شروع میں یسوع خالص انسان تھا۔ لیکن خدا کا کلام اور فضل اس میں اس کثرت سے بس گئے کہ اس سے پہلے کبھی بھی کسی انسان میں نہ پیدا ہوئے تھے۔ اور یوں اس کی حینِ حیات میں الٰہی قوت بڑھتی چلی گئی حتےٰ کہ وہ خدا ہونے کے لئے آسمان پر اٹھایا گیا۔ پس یہ حقیقتاً خدا کا بیٹا نہیں تھا جو کہ مجسّم ہو کر زمین پر آیا بلکہ یہ محض ابنِ آدم تھا جو اوپر اٹھایا گیا اور خدا بن گیا۔ ساموساٹہ کے پولس پر شائد غلطی سے یہ الزام لگایا گیا کہ وہ یہ تعلیم دیتا ہے کہ یسوع انسان سے خدا بن گیا۔

بہت سے لوگ غلطی کی بنا پر یہ خیال کرتے ہیں کہ کلیسیا جامع کی بھی یہی تعلیم ہے۔ کلیسیا نے اس تعلیم کو کیوں نہ قبول کیا؟ ——— یہ تعلیم اس لئے غلط ہے کیونکہ اوّل یہ خیال ہرگز اس حقیقت کو تسلیم کرنے کی گنجائش نہیں چھوڑتا کہ خدا فی الحقیقت انسان کی زندگی میں داخل ہوا۔ ——— دوم۔ کیونکہ وہ شخص جو خدا بننے کے لئے آسمان پر چڑھ گیا خود تو بچ گیا لیکن دوسروں سے نجات کا وعدہ نہیں کر سکتا تھا۔ ——— سوم۔ اگر مسیح آسمان پر چڑھ کر خدا ہو گیا تو دو خداؤں کا مسئلہ بدستور قائم رہا۔ ہم بعد میں بیان کریں گے کہ مسئلہ تثلیث ہی واحد طور پر صحیح جواب مہیّا کرتا ہے۔ اور حقیقت یہ ہے کہ ساموساٹہ کا پولس (PAUL OF SAMOSATA) تثلیث ہی کی تلاش کر رہا تھا مگر

وُہ اس تلاش میں ناکام رہا۔

(۲)، اس موضوع پر غور وخوض کرتے ہُوئے ایک اور رجحان بھی پیدا ہو سکتا تھا یعنی ہم یہ کہتے کہ خُدا واحد ہے اور اُس نے اپنی ذاتِ پاک کو تواتر کے ساتھ مختلف طریقوں سے ظاہر کیا ہے۔ اوّلاً بحیثیت باپ کائناتِ عالم کی تخلیق میں۔ ثانیاً بحیثیت ابن یا بیٹا یسُوع کی شخصیّتِ مُبارک میں۔ ثالثاً بحیثیت رُوح القدس کلیسیا جامع کے بدن میں زندگی بخشتا ہے۔ یہاں تک تو بجا ہے کہ خُدا نے ہمیں تین طریقوں میں اپنا مکاشفہ بخشا ہے لیکن سوال یہ ہے کہ کیا یہ محض تین وسائل ہیں جن سے خُدا نے اپنے آپ کو ظاہر کیا ہے، یا کہ وُہ ازل سے باپ بیٹا اور رُوح القدس ہے اس لئے اُس نے ایسا ظاہر کیا ہے۔ وُہ اُستاد جنہیں سابیلی اَن (SAB ELLIAN) کے نام سے موسوم کیا گیا ہے وثوق سے یہ کہتے تھے کہ یہ تین حیثیتیں محض نام ہیں یا صرف تین صورتیں ہیں جن میں خُدا نے اپنے آپ کو ظاہر کیا یہ تین حیثیتیں خُدا کی ابدی فطرت کا حصّہ نہیں، لہٰذا جب کبھی یہ سوال اُٹھتا ہے کہ کیا صلیب پر باپ نے بصورت بیٹا دُکھ اُٹھایا؟ تو سابیلی اَن (SAB ELLIAN) فوراً جواب دیتے "ہاں" (کیونکہ اُن کے نزدیک تو باپ اور بیٹا ایک ہی شخص کے دو نام ہیں) چنانچہ پارکیسی آس (PARAXEAS) کے خلاف جو کہ ایک سابیلی اَن گروہ کا اُستاد تھا طرطلین (TURTULLIAN) یُوں رقمطراز ہے کہ "اُس نے پاک رُوح کو نکال دیا اور باپ کو مصلوب کر دیا"

اس تعلیم کی کمزوری کو معلوم کرنے کے لئے ایک ہی سوال کافی ہے۔ "خُداوند یسوع مسیح اب کیا کر رہا ہے"؟ اگر مذکورہ بالا تعلیم کے اُستاد اپنے دعوٰی میں حق بجانب ہیں تو ماننا پڑے گا کہ وُہ اب انفرادی زندہ اقنوم کی حیثیت سے موجود نہیں بلکہ وُہ محض ان معنوں میں موجود ہے کہ خُدا ہر وقت

حاضر اور موجود ہے لیکن کلیسیا کو مسیح کا بدن کہا جاتا ہے کیا ان الفاظ کے کچھ معنی ہو سکتے ہیں جب تک کہ یہ تسلیم نہ کیا جائے کہ ازلی بیٹا جو ابتدا سے باپ کے ساتھ ایک ہے، ابھی تک بلکہ ہمیشہ تک انسان ہے اور حقیقی انسان ہے جو ہمیں اپنے بھائی کہنے سے نہیں شرماتا۔ یہاں تک کہ وہ ہمارے بچانے کے لئے موا اور اپنی زندگی کے وسیلہ سے ہمیں بچانے کے لئے ابھی تک زندہ ہے۔

(۳) مسیحی ایمان کے لئے سب سے بڑا خطرہ الیگزنڈریا کے ایلڈر اریئس (ARIUS) کی تعلیم سے پیدا ہوا۔ اس تعلیم کو نائیسیہ کی پہلی کونسل نے ۳۲۵ء میں رد کر دیا۔

اریئس کو بے حد پریشانی ہوئی، کیونکہ اُسے یوں نظر آیا کہ گویا مسیحی لوگ بڑی خوشی سے تین خداؤں کی تعلیم دیتے ہیں۔ اُس نے محسوس کیا کہ خدا کی وحدانیت کو ضرور محفوظ رکھنا چاہیئے۔ چنانچہ وحدتِ الٰہی کے تحفظ میں اُس نے یہ سکھانا شروع کر دیا کہ خدا کا بیٹا خدا کی اعلیٰ ترین اور اولین مخلوق ہے، جو ابدی نہیں جیسا کہ باپ ابدی ہے کیونکہ باپ بیٹے سے مقدم ہوتا ہے۔ وہ باپ کی مرضی سے تخلیق کیا گیا اور باقی تمام مخلوقات اُسی کے وسیلہ سے پیدا کی گئی ہے۔ لہٰذا وہ تمام مخلوقات سے اعلےٰ و بالا ہے۔ لیکن وہ ازلی نہیں " اور وجود میں آنے سے پیشتر وہ موجود نہ تھا۔ ابتدا میں خدا اکیلا اپنے کلام کے بغیر موجود تھا۔ اگر یہ حیثیت درست مان لی جائے تو اس کا مطلب یہ ہو گا کہ وہ کلام جو یسوع مسیح میں مجسم ہوا درحقیقت کسی صورت میں بھی خدا نہیں۔ اریئس (ARIUS) نے بذاتِ خود اس حیثیت کو تسلیم کیا جبکہ اُس نے یہ قلم بند کیا کہ " گو وہ خدا کہلاتا ہے وہ حقیقت میں خدا نہیں لیکن وہ صرف دوسروں کی طرح خدا کے فضل،

میں حصّہ پانے کے وسیلہ سے خُدا ٹھہرا"

ایریئس نے ہمارے زمانہ کے بہت سے لوگوں کی مانند یہ محسوس کیا کہ سب سے اہم بات یہ ہے کہ اس سچائی کی صاف و صریح وضاحت کی جائے کہ خُدا واحد اور لاشریک ہے۔ وُہ واحد ہے، اکیلا ہے، اور واحد سے زائد ہو ہی نہیں سکتا۔ لہٰذا یسُوع مسیح خُدا نہیں ہو سکتا، اس لئے ہم اُسے خُدا تسلیم کئے بغیر بلند ترین درجہ دے سکتے ہیں۔

بہت سے لوگ ایریئس (ARIUS) کے دوست اور پیرو تھے۔ لیکن اُس کی تعلیم کے مقابلہ میں بہت سے کلیسیائی رہنماؤں نے یہ جواب دیا کہ "یہ وُہ تعلیم نہیں جو ہمیشہ مانی اور سکھائی گئی ہے۔ یہ وُہ ایمان نہیں جس سے کلیسیا ہمیشہ زندہ رہی ہے کہ خُدا ہی محمودِ واحد ہے۔ ایریئس (ARIUS) کے پیش کردہ مسیح کی حمد کرنا کفر ہے لیکن کلیسیا تو ہمیشہ مسیح کی عبادت کرتی رہی ہے۔ اب جیسا کہ ہم دیکھ چکے ہیں، بدعتی تعلیمات ہمیشہ مسئلہ کے ایک ہی رُخ پر غور کرتی رہی ہیں، لیکن کلیسیا ہمیشہ دونو پہلوؤں پر غور کر کے جواب دیتی رہی ہے۔ حالانکہ دو حقیقتوں میں جو بظاہر متضاد معلوم ہوتی ہوں، توازن قائم رکھنا مشکل ہے۔ ایریئس نے تو کہا کہ "خُدا واحد ہے اس لئے مسیح خُدا نہیں ہو سکتا۔" مسیحی ایمان نے اس نظریہ کا یہ جواب دیا کہ "خُدا واحد ہے اور مسیح خُدا ہے اس لئے . . . ." اب یہ جُملہ کیسے مکمل ہو؟ یہ کام نائیسیہ کی کونسل نے سرانجام دیا۔

نائیسیہ کونسل نے ایک عقیدہ مرتب کیا جو نظرِثانی کے بعد معمولی فرق کے ساتھ آج تک کلیسیائی عبادت میں بہت مستعمل ہے۔ اس سے یہ بات صاف ظاہر ہو گئی کہ کلیسیا جب مسیح کی عبادت کرتی ہے تو ایمان رکھتی ہے کہ خُدا ہی کی عبادت کرتی ہے۔ وُہ خُدا میں سے خُدا ہے۔ وُہ مولود ہے نہ کہ ——

مخلوق وُہ مخلوقات کا حصہ نہیں بلکہ خُود خالق ہے۔ وُہ باپ کے ساتھ ہم جوہر ہے۔ کلیسیا کے بہت سے لیڈر آخری جملہ کو پسند نہیں کرتے تھے۔ چونکہ بائبل میں کہیں نہیں ملتا۔ اور جو بعد کے مسیحیوں کو مسیحی حقیقت نہیں بلکہ یُونانی فلسفہ معلُوم ہوتا تھا لیکن بالآخر کلیسیا کے رہنماؤں اور مفکّرین کو جو نائیسیہ کی کونسل میں تھے اس سے بہتر اور کوئی الفاظ نہ مل سکے جن کے وسیلہ سے وُہ اپنے اس اعتقاد کو ظاہر کرسکیں، کہ خُدا کا بیٹا باپ کی مانند ازلی ہے یسُوع نے ہمیں سکھایا کہ ہم خُدا کو باپ تصوّر کریں۔ اب ہمارے لئے اُسے کسی اور صُورت میں تصوّر کرنا ناممکن ہے۔ لیکن اگر ہم خُدا کو بحیثیت 'باپ' تصوّر کرتے اور اُس کا ذکر کرتے ہیں تو گویا ساتھ ہی ازلی بیٹے یعنی کلام کو بھی تسلیم کرتے اور اُس کی عبادت کرتے ہیں۔

لیکن پھر خُدا کی وحدانیت کا کیا مطلب ہے؟ اس سوال کا واحد اور ممکن جواب یہ ہے کہ خُدا کی وحدانیت کا مطلب ہرگز یہ نہیں کہ خُدا مُفرد ہے جیسا کہ ایریئیس (ARiUS) کا خیال تھا۔ بلکہ اُس کی وحدت اور ہی طرح سے متصوّر ہونی چاہیئے اور گو اتنے گہرے بھید کو سادہ الفاظ ادا نہیں کر سکتے تاہم ہم اُسے ایک عام فہم صُورت میں پیش کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ ہم نے خُدا کو تین مختلف حیثیتوں میں جانا ہے یعنی خُدا بحیثیت باپ، بحیثیت بیٹا اور بحیثیت رُوح القُدس۔ اور ہم اِسے ان حیثیتوں سے اس لئے جانتے ہیں، کیونکہ خُدا تین طریقوں میں موجُود ہے۔ یعنی خُدا کے پاس خُدا ہونے کے تین طریقے ہیں لہٰذا ہم اُسے صحیح طور پر صرف اُسی وقت جان سکتے ہیں جبکہ ان ہی تین طریقوں میں اُسے جانیں اور مسیحی عبادت ہمیشہ ان الفاظ پر مدار رہی ہے "جلال باپ اور بیٹے اور رُوح القُدس کا ہو"

اس تصور سے تمام سوالات حل نہ ہوئے بلکہ بہت سی مشکلات پیدا ہونے کا امکان پیدا ہو گیا۔ لیکن نائیسیہ میں کلیسیا نے قطعی طور پر ہمیشہ کے لئے کہہ دیا کہ ہم ایسے خیالات کو ہرگز تسلیم نہیں کریں گے، جو ایسی وحدت پیش کریں جس میں ابدی کلام کو دخل نہ ہو اور جن میں مسیح کو عین خدا ماننے کی بجائے اُسے کسی حد تک خدا مانا جائے۔

(۳) یسوع مسیح کی الٰہی اور انسانی فطرت :- کونسل آف نائیسیہ نے اس سوال کو تو حل کر دیا، کہ اگر باپ اور بیٹا دو نو خدا ہیں تو خدا واحد کیسے ہو سکتا ہے مگر بعد ازاں ذیل کے سوال پہ بحث و مباحثہ شروع ہو گیا کہ اگر مسیح خدا بھی ہے اور انسان بھی ہے، تو پھر وہ واحد مسیح کیسے ہو سکتا ہے؟

۱۔ ان اشخاص میں سے جنہیں مندرجہ بالا سوال نے خاص طور پر تنگ کیا ایک عالم اور نیک شخص بنام اپولی نیریئس (APPOLINARIUS) تھا جو کہ ایشیائے کوچک میں چوتھی صدی عیسوی کے آخر میں لدوکیہ کا بشپ تھا۔ اُس نے اس مسئلہ کو اپنے سامنے یوں رکھا:- "ایک شخص میں دو فطرتیں کیونکر یکجا ہو سکتی ہیں؟" مشکل یہ ہے کہ ہم صحیح طور پر نہیں کہہ سکتے کہ یہ الفاظ یعنی "فطرت" و "شخص" وغیرہ الفاظ سے ہمارا کیا مفہوم ہے۔ شاید اپولی نیریئس نے لفظ فطرت پر کچھ اتنا زیادہ اسطور پر سوچا گویا کہ وہ جسم ہے، اور دو جسم یک وقت ایک جگہ نہیں ہو سکتے۔ مثلاً اگر میرا جسم ایک خاص وقت میں ایک خاص جگہ میں ہے، تو اُسی جگہ اُسی وقت کوئی دوسرا جسم نہیں ہو سکتا۔ وحدتِ مسیح کے عقیدہ کو قائم رکھنے کے لئے اپولنیریئس نے یہ خیال پیش کر دیا کہ مسیح میں انسانی روح نہیں تھی بلکہ انسانی روح کی جگہ الٰہی کلام نے لے رکھی تھی جو اُس میں داخل تھا۔ اس تعلیم نے بلاشبہ ہمیں واحد

مسیح تو دیا لیکن کیا یہ ایسا مسیح ہو سکتا ہے جس کی ہمیں بطور نجات دہندہ ضرورت ہے ؟

جلد ہی دیگر مسیحی معلموں نے یہ بات روشن کر دی کہ اگر اپولینیریئس کی تعلیم صحیح ہو کہ مسیح نے ہماری انسانی فطرت اختیار نہ کی تو پھر وہ صرف خدا ہی تھا جو انسانی جامے میں ظاہر ہوا۔ وہ خدا کا کلام نہیں تھا جو مجسم ہوا تھا (یوحنا ۱ : ۱۴) انسانی ضمیر کا حصہ جو سب سے زیادہ گناہگار ہے اور جس کی مخلصی بھی سب سے زیادہ ضروری ہے وہ جسم نہیں بلکہ روح ہے۔ اور مسیح ہماری فطرت کے کسی حصے کو بچا نہیں سکتا جس کو اس نے اپنے اوپر نہ لیا تھا ہمیں تو اپنی نجات کے لئے ایسے مسیح کی ضرورت ہے جس نے تمام فطرت انسانی کو قبول کیا تھا اور پھر بھی ہمیں ایک مسیح کی ضرورت ہے نہ کہ دو کی۔

(۲) اور (۳) ہم دو اور بدعتوں کو اکٹھا کر سکتے ہیں جو کہ اسی مسئلہ کا حل ڈھونڈتے ڈھونڈتے پیدا ہوگئیں۔ اور یہ بدعتیں نیسٹوریئس NESTORIUS اور یوٹی کیز (EUTYCHES) کی تعلیمات تھیں گو ہم مانتے ہیں کہ ان کے مخالفوں نے بہت سی ایسی تعلیمات ان سے منسوب کر دیں جو حقیقت میں انہوں نے کبھی نہیں سکھائی تھیں۔

نیسٹوریئس (NESTORIUS) ایک راہب تھا جو ۴۲۸ء میں قسطنطنیہ کا پیٹری آرک (بزرگ) تھا۔ اس کے لئے یہ مشکل اس بحث سے شروع ہوئی کہ کیا مقدسہ مریم کو "خدا کی ماں" "MOTHER OF GOD" کہنا بجا ہے۔ نیسٹوریئس نے کہا کہ نہیں کیونکہ وہ صرف مسیح کی انسانی فطرت کی ماں ہے۔ خدا کا کلام نہ شروع ہو سکتا ہے نہ پیدا ہو سکتا ہے اور نہ ہی دکھ اٹھا سکتا اور مر سکتا ہے۔ اب اگر یہ قضیہ صحیح ہے تو کیا پھر بھی ہم مسیح کو

واحد مان سکتے ہیں؟ کیا اس خیال کے مطابق دو مسیح اور دو بیٹے ثابت نہیں ہوتے۔ایک الٰہی اور دُوسرا انسانی؟ نیسطوریئس کو عہدۂ بشپ سے معزول کیا گیا اور صحرا میں جلاوطن کر دیا گیا۔ لیکن اُس نے کبھی تسلیم نہیں کیا کہ اُس نے ایسی تعلیم دی ہے۔ وُہ تو صرف یہ چاہتا تھا کہ یہ نہ کہا جائے کہ خُدا کا کلام مخلوق چیز ہے اور کہ اس سے کوئی انکار نہ کرے کہ مسیح کی انسانیت پُوری اور حقیقی ہے۔ اور پُورے طور پر اُس کی فطرت ہماری انسانی فطرت کی مانند ہے۔ البتہ نیسطوریئس کی تعلیم کی اس رنگ میں تشریح کی جاسکتی ہے کہ الٰہی کلام نے انسانی فطرت اختیار کی اور اُسے بطور ایک وسیلہ استعمال کیا گیا لیکن یہ بات بھی بعینہٖ مسیحی عقیدہ کے مطابق نہیں جو یہ ہے کہ خُدا نے ہماری انسانی طبیعت اس طرح پُورے طور پر اختیار کی کہ ایک انسان کے تمام تجربے خُدا کے تجربے بن گئے۔ فقط یہ ماننا کافی نہیں کہ مسیح میں الٰہی بیٹا اور انسانی بیٹا دونوں اکٹھے پہلُو بہ پہلُو موجود تھے۔ کیونکہ یہ بات بھی نئے عہدنامہ کی تعلیم کے معیار پر پُوری نہیں اُترتی جو کہ یہ سکھاتا ہے کہ "وہ کلام مجسّم ہُوا"۔ افسس کی کونسل منعقدہ سلسلہ ۴۳۱ء میں نیسطوریئس (NESTORIUS) کی تعلیم کو رد کیا گیا اور بشپوں نے یہ اعلان کیا کہ مسیح میں دو نو فطرتیں متحد تھیں اس لئے ہم ایک مسیح، ایک بیٹا، اور ایک خُدا مانتے ہیں۔

یہ اعلان درست بھی تھا اور ضروری بھی تھا لیکن کیا یہ ممکن نہیں کہ ایک طرف غلطی سے بچنے کی کوشش میں ہم دُوسری طرف اتنی دُور چلے جائیں کہ غلطی کر بیٹھیں۔ یُوٹی کیز (EUTYCHES) کی تعلیم کا بھی یہی حال ہُوا جسے ہم ایک سادہ سی تمثیل سے واضح کر سکتے ہیں۔ بہت سال گزرے کہ میرا ایک

دوست ایک نیسٹورین (NESTORIAN) بشپ سے ملاقات کرنے کے
لئے جنوبی ہندوستان میں گیا۔ چند منٹوں کے بعد بوڑھے بشپ نے اپنی اُنگلی
ہلاتے ہُوئے میرے دوست سے ٹوٹی پھوٹی انگریزی میں کہا "دُمے اور پانی
کی طرح نہیں بلکہ تیل اور پانی کی طرح" تھوڑی دیر کے لئے تو میرا دوست
حیران تھا کہ بشپ کیا کہہ رہا ہے۔ لیکن اُسے جلد ہی تواریخ کلیسیا یاد آگئی
اور وہ فوراً بھانپ گیا کہ گفتگو کا رُخ شخصیت مسیح کے مسئلہ کی طرف آگیا ہے
"تیل اور پانی کی مانند" یہ ہے نیسٹورین خیال کا مرقع۔ آپ تیل اور پانی کو جتنا
جی چاہے ملائیں لیکن تیل کا ہر قطرہ پانی کے ہر قطرے سے الگ رہیگا۔ لیکن
مے اور پانی کے یکجا ہونے سے کیا ہوتا ہے؟ آپ اُنہیں ملائیں تو وُہ ایسے مکمل طور پر
مل جاتے ہیں کہ آمیزش میں ایک سے دُوسرے کا فرق معلوم نہیں ہوتا۔ یوٹی کیز
کی تعلیم کچھ ایسی ہی تھی۔ ایک مسیح اور ایک خُدا کو ماننے کے شوق میں معلوم ہوتا
ہے کہ اُس نے گویا یہ تعلیم دی کہ انسانی فطرت پر الٰہی فطرت ایسے چھا گئی کہ
وُہ بھی الٰہی ہو گئی اور ہماری انسانی فطرت کے مشابہ نہ رہی۔ "میں مانتا ہوں کہ
خُداوند ایک ہے۔ اور وُہ فطرتوں پر مشتمل ہے جو بعد میں مل کر ایک ہو گئیں"
یوٹی کیز یہ تو مانتا تھا کہ "مسیح خُدا کے ساتھ ہم جوہر ہے" لیکن وُہ یہ نہیں مانتا تھا
کہ وُہ ہمارے ساتھ بھی بدن میں ایک ہے ——— اس قسم کی تعلیم نے
کم از کم یہ ثابت کر دیا کہ مسیح جس کی ہم عبادت کرتے ہیں ایک مسیح ہے۔ لیکن
کیا اس طرح اُس کی ذات کی وحدت کو قائم رکھنا ایک مہنگا سودا نہیں؟
اناجیل اربعہ ایک ایسے شخص کی تصویر پیش کرتی ہیں جو کہ حقیقت میں ایک
انسان ہے "جو ہماری طرح سب باتوں میں آزمایا گیا پھر بھی بے گناہ رہا"
(عبرانی ۴: ۱۵) وُہ ہمیں بچا سکتا ہے کیونکہ اُس نے اُسی کشمکش کا مقابلہ

رکیا جس کا ہمیں مقابلہ کرنا پڑتا ہے۔ وہ ہم میں گناہ پر فتح پا سکتا ہے کیونکہ اُس نے پہلے ہمارے لئے فتح پائی۔ آجکل بہت سے جوشیلے مسیحی قریباً وہی کچھ ملتے ہیں جو یوٹی کیز (EUTYCHES) مانتا تھا۔ مسیح ہمارا نمونہ ہے (۱ پطرس ۲ : ۲۱) لیکن جب لوگوں کو مسیح کے نمونہ کی پیروی کرنے کی تلقین اُس کے فضل پر بھروسہ کرکے کی جاتی ہے تو وہ اکثر یہ جواب دیتے ہیں "اوہ۔ لیکن وہ تو خدا کا بیٹا تھا"۔ مطلب یہ کہ اُس کے لئے آسان تھا۔ اُس کی الٰہی فطرت نے اُسے ان انسانی آزمائشوں سے بالاو بلند کر رکھا تھا جن کا مقابلہ ہماری معمولی انسانی فطرت کو کرنا پڑتا ہے۔ ایسا مسیح نہ تو ہمارا نمونہ ہو سکتا ہے اور نہ ہی ہمارا نجات دہندہ۔

اب وقت آ چکا تھا کہ ان مسائل کا قطعی فیصلہ کیا جائے۔ چنانچہ دوبارہ ایک اور بڑی کونسل بلائی گئی اور ۴۵۱ء میں کیلسیڈون (CHALCEDON) میں بشپوں کی ایک بڑی جماعت فیصلہ کرنے کے لئے جمع ہوئی۔ لیکن آخر کونسلوں میں کمزور انسان ہی تو ہوتے ہیں۔ اکثر اُن میں محبت اور فیاضی کی کمی ہوتی ہے اور کئی دفعہ اُن کی کارروائیوں میں بڑی بدامنی نظر آتی ہے۔ تاہم اُن قدیم کونسلوں کے فیصلوں کو ہر زمانے نے مانا ہے۔ کوئی انسانی عقل ذاتِ باری تعالےٰ کو انسانی الفاظ میں بیان نہیں کر سکتی یا یُوں کہیں کہ اُس کے متعلق پوری سچائی کو بیان کرنے سے قاصر ہے تاہم انسان حد و حدود ضرور مقرر کر دیتے ہیں اور ہمیں بتا دیتے ہیں کہ ان حدود کے مابین ہی حقیقت کو جان سکتے ہیں۔ ہم کیلسیڈون کی کونسل (COUNCIL OF CHALCEDON) کے فیصلے کی بے حد اہم باتوں کو ذیل میں پیش کرتے ہیں۔

"ہم یہ ایمان رکھتے اور بالاتفاق سکھاتے ہیں کہ ہمارا خداوند یسوع

مسیح ہی واحد بیٹا ہے، جو کہ بیک وقت کامل خُدا اور کامل انسان ہے حقیقی خُدا اور حقیقی انسان۔ وہی واحد مسیح۔ بیٹا۔ خُداوند اور اکلوتا ہے جو بلا ملاوٹ۔ بلا تبدیلی۔ بلا تفریق اور بلا تقسیم دو فطرتوں میں ظاہر کیا گیا جن میں باوجود باہمی اتحاد کے ہر دو فطرتوں کے خواص الگ الگ محفوظ رہتے ہیں۔ لیکن پھر بھی شخصیت نہ جُدا ہوتی ہے اور نہ ہی دو حصّوں میں منقسم ہوتی ہے بلکہ وُہ بیٹا اور ــــــ کلام خُدا ــــ اور یسوع مسیح ہے۔

جن اشخاص نے اس بیان کو قلمبند کیا وُہ کیا کہنا چاہتے تھے؟ کوئی انسانی الفاظ یسُوع مسیح کے بھید کو پُوری طرح واضح نہیں کر سکتے تاہم اُنہیں وہی الفاظ استعمال کرنے تھے جو اُن کے پاس تھے۔ جیسے کہ ہم اپنی ضروریات میں وُہی الفاظ استعمال کرتے ہیں جن کا ہمیں علم ہے۔ چنانچہ بعض مستعمل الفاظ مثلاً فطرت اور شخص وغیرہ وغیرہ ہمیں پُوری طرح سمجھ نہیں آتے۔ لیکن وُہ ایک بڑا اہم کام کرنے کی کوشش کر رہے تھے۔ وُہ اس ایمان کو قائم اور محفوظ رکھنا چاہتے تھے جو اُنہوں نے رسُولوں اور انجیلی مُبشروں کی تحریرات میں پایا۔ لیکن اُنہوں نے ان دقیق باتوں کو سادگی سے بیان کرنے سے انکار کیا ہے۔ اُن کی تعلیم کا نچوڑ چار باتوں پر مشتمل ہے۔ جو لفظ "بلا" کے ساتھ شروع ہوتی ہیں۔

"بلا ملاوٹ":۔ بعض لوگ مسیح کو "خُدا۔ انسان" کہتے ہیں۔ یہ ایک خطرناک محاورہ ہے۔ کیونکہ یہ محاورہ بڑی آسانی سے یہ خیال پیش کرتا ہے کہ مسیح کچھ خُدا ہے اور کچھ انسان ہے۔ یا اُس سے یہ سمجھا جا سکتا ہے کہ مسیح خُدا اور انسان کے درمیان ایک ہستی ہے۔ لیکن اس صُورت میں وُہ نہ تو پُورا خُدا ہی ہوگا اور نہ ہی پُورا انسان۔

بلا تبدیلی :- ہمیں یہ نہیں کہنا چاہیئے کہ جب مسیح پیدا ہوا تو خدا انسان میں تبدیل ہو گیا۔ یا جب مسیح آسمان پر چڑھا تو انسان خدا میں تبدیل ہو گیا۔ یہ بھی نہیں کہنا چاہیئے کہ جب وُہ زمین پر زندگی گزارتا تھا تو اُس کی الٰہی فطرت انسانی فطرت میں تبدیل ہو گئی۔ اور وُہ حقیقی خدا نہ رہا۔ ہمیں یہ بھی خیال نہیں کرنا چاہیئے کہ اُس کی انسانی فطرت پر الٰہی فطرت اس طرح چھا گئی کہ وُہ حقیقی انسان نہ رہا۔

بلا تقسیم :- ہم ایمان رکھتے ہیں کہ پاک رُوح ہمارے اندر سکونت کرتا ہے۔ تاہم ہم میں اور پاک رُوح میں فرق رہتا ہے۔ ہم میں "میں اور وُہ" کا رشتہ رہتا ہے۔ اور ہم میں ہمیشہ دُوئی رہتی ہے۔ لیکن مسیح کے حق میں ایسا نہیں ہوتا گویا کہ دو مسیح ہیں ایک انسانی اور ایک الٰہی جو کہ پہلو بہ پہلو موجود تھے اور ایک دُوسرے سے اپنے فعل میں آزاد تھا۔

بلا تفریق :- مسیح کی شخصیت میں خُدا اور انسان ہمیشہ کے لئے اکٹھے ہو گئے ہیں۔ وُہ ابھی تک ابنِ خُدا اور ابنِ آدم ہے اور ہمیشہ تک یُونہی رہے گا۔ اُس کی سلطنت کی انتہا نہ ہوگی۔ ابدی بادشاہت کے جلال میں بھی وُہ ناصرت کا یسُوع ہوگا جسے ہم جانتے اور پیار کرتے ہیں۔

کیلسیڈون کی کونسل کے بعد بھی وُہ تنگ کرنے والے یُونانی اس موضوع پر سوال پُوچھنے سے باز نہ رہے (وُہ کہتے تھے کہ کیا مسیح میں ایک مرضی (WILL) تھی یا دو۔ یعنی کیا وُہ انسانی اور الٰہی مرضی دونوں تھیں وغیرہ) لیکن وُہ زیادہ اہم سوالات پہلی چار صدیوں میں پُوچھ چکے تھے اور مسیحی آہستہ آہستہ اور قدرے تشکک کے ساتھ اُن سوالات پر غور کرتے رہے اور کئی ایک نتائج پہ پہنچے جو کہ اگرچہ ہمارے سامنے سوالوں کے جوابات

تو ہم نہیں پہنچا سکتے۔ تاہم جب ہم خُود مسیح کو جاننے کی کوشش کرتے ہیں تو وہ ہماری رہنمائی کر سکتے ہیں۔

یہاں تک جو تعلیم مسیح کے بارے میں دی جا چکی ہے، اُسے ہم مختصر طور پر چار سرخیوں کے ماتحت پیش کرتے ہیں۔

اوّل۔ اُسکی پُوری اور کامل اُلوہیت: وہ خود خدا تھا جو دُنیا میں آیا اور ہمارے درمیان رہا۔ مسیح کی آمد سے قبل خُدا نے بہت سے پیغمبر بھیجے تھے اور اب گویا اُس نے یُوں کہا (جیسا کہ ہم عام الفاظ میں کہہ سکتے ہیں) "میں پیغمبر بھیج بھیج کر تھک گیا ہُوں اب میں خُود جاؤں گا۔"

دوم۔ اُسکی پُوری اور کامل انسانیت: وہ درحقیقت انسان ہے بحیثیت انسان وہ کوئی غیر معمُولی تحفظ اور رعایت کا متمنی نہیں۔ وہ دُکھوں اور آزمائشوں سے مستثنےٰ نہ تھا۔ وہ محض اپنی بے گناہی کے باعث ہم سے جُدا حیثیت رکھتا ہے۔ باقی تمام انسانی تجربات میں وہ ہمارے ساتھ شریک ہے۔

سوم۔ اُسمیں خُدا اور انسان کا کامل اتحاد تھا: وہ محض ایک عظیم المرتبت نیک انسان ہی نہیں تھا جس میں دیگر انسانوں کی مانند خُدا کا رُوح بستا ہے۔ بلکہ یہ کہنا زیادہ موزوں ہوگا کہ یسوع میں متجسد خُدا ہے۔ (اگر ہم یہ الفاظ مؤدبانہ طور سے کہیں) جس نے یہ سیکھا کہ انسان ہونا کیا معنی رکھتا ہے۔

چہارم۔ اُسمیں الٰہی اور انسانی فطرتوں کا ملاپ ہے: ہمیں کبھی یہ تصور نہیں کرنا چاہیئے کہ کسی وقت تو وہ خُدا تھا

اور کسی وقت انسان۔ ہمیں یہ بھی کبھی نہیں کہنا چاہیئے کہ وہ بحیثیت انسان سوتا یا کھاتا تھا اور بحیثیت خدا آس نے پانچ ہزار کو کھانا کھلایا۔ دراصل وہ ہمیشہ خدا ہی تھا اور ہمیشہ انسان تھا۔ اور یہ اُس کی صلیبی کمزوری اور پستی ہی سے تھا کہ ہمیں معلوم ہُوا کہ درحقیقت خدا کیسا ہے۔

بہت کچھ جو اِس باب میں لکھا گیا ہے شاید آپ کو عجیب اور ہماری سمجھ سے باہر چیز نظر آئے لیکن کیا ان پرانے جھمیلوں سے ہمیں کچھ فائدہ پہنچ سکتا ہے؟ شاید اس بحث سے براہِ راست ہم میں سے ہر ایک کو فائدہ نہ پہنچے۔ لیکن اگلے باب میں ہم کلیسیا کی گواہی دینے کی ذمہ داری اور ان مسائل پر غور کریں گے جو اِن سوالات سے پیدا ہوتے ہیں جو غیر مسیحی آج بھی ہم سے کیا کرتے ہیں ایسے حالات میں ہم محسوس کریں گے کہ دورِ رفتہ کی تواریخ کے سکھائے ہوئے اسباق ہمارے لئے مفید ہیں اور کہ پرانے مباحثوں اور جھگڑوں کو سمجھنا خدا کے نام کو دُنیا میں سنانے اور سب قوموں میں اُس کی نجات کا اعلان کرنے میں بہت فائدہ مند ہیں۔

چھٹا باب

مسیح کے حق میں ہماری گواہی

"تم میرے گواہ ہو"! یہ الفاظ مسیح نے اپنے شاگردوں سے کہے تھے

آج بھی ہر ایک مسیحی کے لئے مسیح کے یہی الفاظ ہیں۔ خُدا کی مرضی یہ ہے، کہ خُداوند یسُوع مسیح کی خوشخبری دُنیا میں ایک ایک شخص کو سُنائی جائے اور یقیناً یہ کام انجام نہیں دیا جا سکتا تاوقتیکہ ہر ایک مسیحی اس میں ہاتھ نہ بٹائے۔ لیکن مسیح کون ہے جس کا پیغام ہم نے اُن تک لے جانا ہے جو اُسے نہیں جانتے اور ہم نے اُس کے متعلق اُنہیں کیا بتانا ہے؟

دُنیا میں لاکھوں ایسے لوگ ہیں جنہوں نے شائد مسیح کا نام تک بھی نہیں سُنا۔ اُن کے واسطے تو ہمارے لئے کوئی مُشکل نہیں۔ لیکن بے شمار ایسے ہیں جو اُس کے بارے میں جانتے تو ہیں اور ہو سکتا ہے کہ اُس میں دلچسپی بھی رکھتے ہوں، لیکن وُہ یا تو اُن سارے دعاوی کے منکر ہیں جو اُس کے حق میں اِس کتاب میں مذکور ہوئے ہیں یا اُن دعاوی کے صرف بعض حصّوں کو تسلیم کرتے ہیں یا اُن کو ایسے طور سے مانتے ہیں جو حقیقتاً نہ ماننے کے برابر ہے۔ اُن سوالوں اور انکاروں پر نظر ڈالنے سے شاید ہمیں سب سے بڑھکر اس بات میں مدد ملے کہ ہم اپنے ایمان کو غیر مسیحیوں کے ساتھ سمجھوتے کے بغیر صاف طور سے سمجھ سکیں۔

یہُودی۔ آیئے ہم مسیح کے اپنے لوگوں یعنی یہُودیوں سے اس مُبحث کو شرُوع کریں۔ عرصہ دراز گزر چکا ہے کہ اُنہوں نے اُسے قبُول نہ کیا۔ بہت سے یہوُدی آج بھی اُسے رَدّ کرتے ہیں لیکن اب کُچھ عرصہ سے اس قوم میں تبدیلی آچکی ہے لیکن ایک مُدت تک یہوُدی مسیح کے نام سے بھی نفرت کرتے تھے۔ آجکل بعض یہوُدی تسلیم کرتے ہیں کہ اُن کے آباء و اجداد نے بڑی غلطی کی جو اُسے مصلوب کیا۔ اور وُہ کہتے ہیں کہ ہمیں چاہیئے کہ مسیح کو ایک اُستاد کامل تسلیم کریں لیکن وُہ اس مرحلہ سے آگے نہیں بڑھتے۔

یہ کوئی تعجب کی بات نہیں کہ یہودیوں کے لئے مسیح کے متعلق ٹھنڈے دل سے سوچنا بڑا مشکل ہے۔ حال ہی میں ایک نوجوان یہودی دوست نے جو نئے عہد نامہ میں دلچسپی رکھتا ہے، اس کتاب کے مصنف کو ایک خط لکھا "مسیح کا نام ہمارے لئے ایک مشکل چیز ہے۔ جب ہمیں یاد آتا ہے کہ گذشتہ صدیوں میں کس طرح مسیحیوں نے مسیح کے نام پر یہودیوں پر کیا کیا مظالم ڈھائے تو یہ محسوس ہوتا ہے، کہ ہمارے لئے مسیح کا نام کس قدر ٹھوکر کا باعث ہے"!

مَیں نے اُسے جواب دیا "نام کے بارے میں آپ فکر نہ کریں۔ آپ اس کے بارے میں اُس نام کی روشنی میں سوچیں جو اُس نے خود استعمال کیا۔ یعنی "ابنِ آدم" اور پھر دیکھیں کہ آپ کہاں پہنچتے ہیں۔ کیا مَیں نے اُسے ٹھیک جواب دیا؟ مسیح نے ہمیں یہ نہیں بتایا کہ وہ کون ہے۔ وہ ہمارے پاس ایک نامعلوم ابنِ آدم کی طرح ایک سوال لے کر آیا۔ اور اگر ہم شاگردوں کی طرح اُس کی پیروی کرنا شروع کر دیں تو ایک وقت آئے گا کہ شاگردوں کی مانند ہم بھی اُس کے اس سوال کا جواب دے سکیں گے"۔ مگر تم مجھے کیا کہتے ہو؟"

لیکن یہودی کے لئے مسیح کی قیمت حاصل کرنے کا ایک اور طریقہ بھی ہے۔ بہت سے یہودیوں نے آنے والے مسیح کا خیال ترک کر دیا ہے یا یہ کہ یہودی قوم ہی مسیح ہے۔ لیکن ہمیں یاد کرنا چاہیئے کہ ابتدائی مسیحیوں نے نہ صرف یسوع کو "مسیح" کہا بلکہ اُسے "خدا کا خادم" بھی کہا۔ حال ہی میں ایک مسیحی عالم نے ایک یہودی دوست سے کہا کہ یہودی علماء نے یسعیاہ کے مشہور ابواب ۴۰ تا ۶۶ کے متعلق جن میں کہ خداوند کے خادم کے گیت مرقوم ہیں بہت کچھ تحریر نہیں کیا۔ یہودی عالم نے جواب دیا کہ "ہم ان ابواب

کو بالتفصیل پڑھنے کی جرأت نہیں کرتے۔ کیونکہ ہم اچھی طرح جانتے ہیں کہ وُہ ہمیں کہاں لے جائیں گے۔ کیا یہ بات سچ ہے؟ کیا کوئی مسیحی گذشتہ صدیوں میں یہودیوں کی برداشتِ ایذا کو یاد کرکے پولُس کے ساتھ یہ کہنے سے باز رہ سکتا ہے "اے بھائیو میرے دل کی آرزو اور اُن کے لئے خُدا سے میری دُعا یہ ہے کہ وُہ نجات پائیں" (رومی ۱۰: ۱)

اہلِ اسلام :- دُنیا کے بڑے مذاہب میں سے صرف اسلام ہی ایک ایسا مذہب ہے جو مسیح کے بعد شروع ہوُا۔ ابتدا ہی سے اسلام نے مسیحیت کے بہت سے بُنیادی اصُولات کا انکار کیا ہے۔ قرآن کریم مسیح کو ایک نبی اور کنواری سے مولود مانتا ہے۔ اور اُسے رُوح اللہ کے نام سے موسُوم کرتا ہے۔ تاہم، اسلام مسیح کی صلیبی موت کا انکار کرتا ہے۔ اور اسی وجہ سے مسیح کے جی اُٹھنے کو بھی نہیں مانتا۔ اور اس خیال کو کہ مسیح خُدا کا بیٹا ہے، بڑی نفرت سے ردّ کرتا ہے۔ یہ شاید اس لئے ہوُا کہ حضرت محمد صاحب اس محاورہ کو مادّی اور جسمانی معنوں میں سمجھے۔ کیا خُدا کو شادی کرنا اور انسانوں کی طرح بچّے پیدا کرنا لازمی ہے؟ یہ خیال اس لئے بھی ردّ کیا گیا کیونکہ حضرت محمد صاحب وحدتِ الٰہی کا ایک خاص تصوّر رکھتے تھے جس کے مطابق ذاتِ الٰہی میں اشخاص کی رفاقت ناممکنات میں سے ہے۔ اسلامی تصوّر کے مطابق خُدا واحد اور لاشریک ہے۔ وُہ وحدتِ محضہ ہے۔ اس اسلامی نظریہ کے ماتحت سب سے بڑا گناہ یہ کہنا ہے کہ "خُدا کا شریک" ہے۔

ان حالات میں ہم مُسلمانوں کے سامنے مسیح کو کیسے پیش کریں؟ اگر ہم قرآن کریم سے اس مُبحث کو شروع کریں اور مسیح کے حق میں وُہ قرآنی شہادتیں

جو جا بجا پائی جاتی ہیں پیش کریں تو ہمیں بہت فائدہ حاصل نہ ہوگا۔ ہماری بات چیت کا آغاز یوں ہو سکتا ہے کہ ہم اپنے مسلمان بھائی سے یہ درخواست کریں کہ وہ تعصب کو دور کر کے، خالی الذہن ہو کر مسیح کی اُس صورت پر نظر ڈالے جو کہ اناجیل میں پیش کی گئی ہے۔ اور وہ اُس کی انسانی زندگی پر غور و خوض کرے۔ یہ قدم بھی آسان نہیں۔ کیونکہ برادرانِ اسلام کو یہ سکھایا گیا ہے کہ مسیحیوں نے اپنے نوشتوں میں ردّ و بدل کر دیا ہے۔ لیکن اگر کسی صورت سے ہم اپنے مسلمان بھائی کو انجیل شریف کا مطالعہ شروع کرنے پر آمادہ کر دیں تو لازماً مسیح کی سیرتِ پاک، اخلاق حسنہ اور خصائل خود ہی اُس پر اثر انداز ہونے لگیں گے۔ اور وہ ان معیاروں اور اصولوں پر سوچنے لگے گا جو اُس کے سامنے اُس کے اپنے مذہبی عقائد نے پیش نہیں کئے۔ اگر وہ متعجب سا ہو جائے تو یہ ایک ایسا مقام آئیگا جہاں سے ہم اُس کے ذہن کو اور آگے پہنچا سکتے ہیں۔ کیونکہ قرآن کریم میں مسیح کو کلمۃ اللہ کے لقب سے ملقب کیا گیا ہے۔ اور یہی ایک مقام ہے جہاں مسلمان اور مسیحی مل سکتے ہیں۔ ایک مسلمان کے لئے "کلام" کا تصور اتنا ٹھکرا دینے والا نہیں جتنا کہ ابن اللہ کا تصور ہے۔ اگر وہ اس خیال کو ذہن نشین کر سکے کہ اس کے کیا معنی ہیں کہ مسیح ازلی کلام ہے تو پھر وہ یقیناً یہ بھی سمجھ سکے گا کہ مسیحی لوگوں کا کیا مطلب و منشا ہے، جب وہ یہ کہتے ہیں کہ "مسیح ابدی بیٹا ہے"۔

اہلِ ہنود:۔ اہلِ ہنود کا دعویٰ ہے کہ ہندو دھرم دنیا میں تمام مذاہب سے زیادہ روادار ہے۔ ایک لحاظ سے یہ بات سچ ہے۔ کیونکہ ہندوؤں میں کوئی مقررہ اور کٹر عقیدہ نہیں۔ وہ آسانی سے کوئی نیا خیال یا نیا دیوتا اختیار کر لیتے ہیں۔ اور بہت سے ہندو آج یہ کہنے کو تیار ہیں

گے کہ ہم مسیح کو نسلِ انسانی کے بچانے والوں میں سے ایک نجات دہندہ مانتے ہیں۔ لیکن کیا انسانیت کو بچانے والے ایک سے زیادہ ہو سکتے ہیں۔ اور کیا ہم مسیح کو بنی نوعِ انسان کے بڑے بڑے اُستادوں کے درجہ تک ہی محدود رکھ سکتے ہیں؟ لوگ اس سوال کے جواب میں کہیں گے کہ ہاں ہندوؤں کا ایک فرقہ دس اوتاروں کو مانتا ہے اور ہندوؤں کی ایک مستند کتاب میں پرماتما کہتا ہے کہ "جب کبھی بدی پھیل جاتی ہے تو میں دُنیا میں داخل ہوتا ہوں تاکہ بدوں کو نیست کروں اور نیکوں کو بچاؤں"۔ لیکن ہر اوتار ایک لباس کی مانند ہے جو کہ پرماتما کچھ وقت کے لئے پہن لیتا ہے اور جب وہ پرانا ہو جاتا ہے تو اتار پھینکتا ہے۔ اب ہم معلوم کر سکتے ہیں کہ ان خیالات سے کلیسیا کے ابتدائی دنوں کے خیالات ملتے جلتے ہیں جنہیں کلیسیا رد کرنے پر مجبور ہوئی۔

ہندوؤں کو مسیحی یہ جواب دے سکتے ہیں کہ ہمیں خُدا کے اُن دیگر اوتاروں کا کوئی تواریخی علم نہیں چہ جائیکہ مسیح کی کہانی تو صاف صاف تواریخ کے اوراق پر لکھی ہے۔ لیکن اس سے بھی بڑھکر یہ سوال اُٹھانا لازمی ہے، کہ جی اُٹھنے کے بعد مسیح کیا کام کرتا رہا ہے؟ جیسا کہ ہم معلوم کر چکے ہیں کہ عہدِ جدید کی یہ تعلیم ہے کہ وہ ابد تک یکساں ہے۔ "یسوع مسیح کل اور آج بلکہ ابد تک یکساں ہے" (عبرانی ۱۳ : ۸) وہ آخری آدم ہے جس میں تمام نوعِ انسان نے زندگی کی ایک نئی پیدائش حاصل کی ہے اور جس سے تمام نوعِ انسان متعلق ہے۔ (رومی ۵ : ۱۲-۲۱ و ۱کرنتھی ۱۵ : ۴۵) چونکہ وہ جی اُٹھا ہے اس لئے جو اُس پر ایمان لائے وہ ذاتِ الٰہی میں شریک ہو گئے ہیں (۲پطرس ۱ : ۴) اگر یہ سچ ہے تو کسی دوسرے نجات دہندہ کا سوال ہی پیدا نہیں

ہوتا۔ اور اگر کوئی اور نجات دہندہ آبھی جائے تو وُہ ہمیں کیا دے گا جو مسیح نے پہلے ہی نہیں دے رکھا؟

بُدھ مت کا پیرو:۔ شائد ہمیں سب سے زیادہ مُشکل کا سامنا بدھ مت کے ایک پیرو کے ساتھ کرنا پڑتا ہے۔ کیونکہ اُس کے وشواش کے مطابق خُدا کا وجُود ہی نہیں۔ اس لئے خُدا کے خلاف کوئی گُناہ بھی نہیں ہو سکتا اور یُوں گُناہ سے مخلصی پانے کی ضرورت ہی پیدا نہیں ہوتی۔ دُکھ درد سب سے بڑی بدی ہے اور خواہش دُکھ کی علامت ہے۔ وُہ کہتا ہے کہ اگر خواہش کو زندگی میں سے نکال دیا جائے تو دُکھ خود بخُود مٹ جائیں گے۔ محبّت خواہش کی ایک صُورت ہے۔ اس لئے جب مسیحی لوگ کہتے ہیں کہ محبّت ہی سب سے بڑی خُوبی ہے تو وُہ گویا بدھ دھرم کی تعلیم کے مطابق انسان کو اُسی چیز میں پھنساتے ہیں جس سے اُسے مخلصی حاصل کرنا چاہیئے ہم اس سوال کا کیا جواب دے سکتے ہیں؟ ہم غور کریں کہ کونسی چیز اُتم درجہ رکھتی ہے۔ بُدھ کی وُہ ہمدردی جس سے اُس کے اپنے سکونِ قلب میں کوئی خلل پیدا نہیں ہوتا۔ یا کہ مسیح کی صلیب جس میں کہ وُہ زندگی کے تمام گُناہ۔ دُکھ اور رنج والم اپنے اُوپر اٹھا لیتا ہے؟ ضرُوری ہے کہ ہم ایک بُدھ دھرم کے پیرو کے سامنے مسیح کی صلیب کو صرف ایک نیک آدمی کی موت سے مشابہت پیدا کر کے پیش نہ کریں بلکہ اُسے ایسے منظر کے طور پر پیش کریں جس میں دُنیا کی عمیق ترین حقیقت ظاہر ہوتی ہے۔ کیونکہ صلیب پر ایک نا معلوم طریقے سے خُدا بذاتِ خُود انسان کے گناہوں کے بدلے دُکھ اُٹھاتا ہے۔ مسیح زندگی کو بے معنی بنانے نہیں آیا بلکہ زندگی کو معمُور کرنے آیا تھا اور یہ منظر صرف صلیب میں ہی ظاہر

ہوتا ہے کہ زندگی کی معموری کے کیا معنی ہیں۔ زندگی کی معموری عمر پوری ہم سے مطالبہ کرتی ہے کہ ہم خوشی سے دُکھوں کی برداشت کریں۔ اس کا مطلب اُن سے فرار حاصل کرنا نہیں۔

یہ چار مختصر بیانات ہم پر ظاہر کرتے ہیں کہ دیگر مذاہب کے مقابلہ میں ہمیں ان باتوں کا استعمال کرنا ہے جو کہ اِس کتاب میں پہلے آچکی ہیں لیکن ہمارا واسطہ صرف پرانے مذاہب ہی سے نہیں بلکہ دُنیا میں اور بھی بہت سی تعلیمات کام کر رہی ہیں جن کے مقابلہ میں بھی ہمیں عہدِ جدید اور تواریخ کلیسیا سے استفادہ کرنا ہوگا۔

(۱) سائنس کی خوش اعتقادی۔ بہت سے لوگ سائنس کی حیرت انگیز ترقی کے زیرِ اثر انسان کا مستقبل بڑا روشن تصور کرتے ہیں۔ وُہ سمجھتے ہیں کہ اگر ہم اچھی تعلیم اور تجویز کے ساتھ سائنس کا استعمال کریں تو ہم غربت اور بیماری کو نیست و نابود کر سکتے ہیں پھر ہر طرف خوشی اور فارغ البالی ہوگی۔ ایسی تمام خوش اعتقادیوں اور اُمیدوں کے ضمن میں مسیح آگاہی کرتا اور فیصلہ دیتا ہے۔ حضرت انسان ہر چند ہوشیار ہے پھر بھی خُدا کے ساتھ اُس کا واسطہ ہے۔ خُدا مسیح کے وجُودِ پاک میں تھا۔ اور خُدا دُنیا میں سب سے زیادہ مہذّب لوگوں کے پاس آیا لیکن اُنھوں نے اُسے قبُول نہ کیا اور اُسے صلیب دی۔ کیا ہمیں یقین ہے کہ آج کی تہذیب، تمدّن اور تجاویز انسان کے دل کی بدی کو دُور کر سکتے ہیں ؟ انجیل کے پیغام میں زیادہ عملی رنگ پایا جاتا ہے۔ انجیل تمام زندگی کو نیکی اور بدی کا میدانِ عمل تصوّر کرتی ہے، اور جنگ اتنی ہیبتناک ہے کہ اُس کو دیکھ کر بالآخر خُدا خُود میدانِ جنگ میں اُتر آیا۔ مسیح یسُوع کے وجُودِ پاک میں خُدا نے بدی پر ہمیشہ

کے لئے سزا کا حکم دے دیا ہے۔ اور اب صرف اس کی سزا اور فتح میں شامل ہونے کے وسیلہ سے ہی انسانی اور دُنیاوی بدی کو دُور کیا جا سکتا ہے۔

(۲) مایوسی:- "کون ہمیں کوئی اچھی چیز دکھائیگا" مغرب میں بہت سے لوگوں کی یہی حالت ہے۔ بالآخر یہ ثابت ہو گیا ہے کہ تہذیب کوئی بڑی حسین چیز نہیں۔ اس نے لوگوں کو بے حد دولتمند تو بنا دیا ہے، لیکن اُن کی خوشی میں کوئی اضافہ نہیں کیا۔ ایٹم بم (ATOM BOMB) کا خوف دُنیا پر چھایا ہوا ہے۔ بیشمار لوگوں کی یہ حالت ہے کہ انہیں بعد از موت کی قسم کی زندگی کی اُمید نہیں ——— ایسے لوگوں کو خُدا کا کلام کہتا ہے "اُس نے اپنی اُمت پر توجہ کر کے اُسے چھٹکارا دیا" (لوقا ۱: ۶۸) مسیح دُنیا کے اُن بڑے آدمیوں میں سے نہیں جو محض اچھے اچھے خواب دیکھتا ہو اور دُوسروں کو اپنے خواب سُناتا ہو۔ وہ تو خُود خُدا ہے جو ہمیں پکڑتا ہے اور ہم سے یُوں گویا ہوتا ہے "میں تمہیں جانے نہیں دُوں گا"۔ خُدا نے وعدہ کر رکھا ہے کہ وہ ہمارا خُدا ہوگا (۲ کرنتھیوں ۶: ۱۶) اس کے ثبوت میں وہ اس سے بڑھ کر اور کیا کر سکتا تھا کہ اُس نے ہماری انسانی فطرت کا جامہ پہن لیا اور ہمارے درمیان رہا۔ اگر یہ سچ ہے۔ تو انسانی مایوسی کے لئے کوئی جگہ نہیں رہتی۔ خُدا سے رفاقت رکھنے سے مسرور اور پُر فخر زندگی بن جاتی ہے جس کا مطلب ہے دُوسروں کی خدمت کرنا۔

(۳) اشتراکیت:- اشتراکی دعویٰ کرتا ہے کہ مستقبل اس کے ہاتھ میں ہے اور کہ وہ ایک ایسی نئی دُنیا بنائے گا جس میں سماج کے درجات نہ رہیں گے بلکہ مساوات ہوگی جس میں تمام پُرانی بُرائیاں معدُوم ہو جائیں گی اور لوگ خُوش باش رہیں گے۔ مذہب ایک غیر حقیقی۔

غیر اصُولی اور غیر ضروری چیز ہے ۔ اس بحث پر ہم مسیح کے جی اُٹھنے کی طرف رجُوع کرتے ہیں ۔ اگر مسیح کا جی اُٹھنا سچ ہے اور اگر جی اُٹھنے کے سبب مسیح قدرت سے خُدا کا بیٹا ٹھہرا ہے (رومی ۱: ۴) تو پھر مستقبل اُس کے ہاتھ میں ہے ، نہ کہ اشتراکی کے ہاتھ میں اور جہاں کہ اشتراکی کی اُمیدیں زمان و مکان کی پابند ہیں وہاں مسیحیوں کی اُمید خُدا کی ابدی بادشاہت سے وابستہ ہے ۔

اِس موضوع پر ہمارے پاس اس قسم کی دلائل ہیں جو ہم بے دینوں سے گفتگو کرتے وقت پیش کر سکتے ہیں ۔ جب ہم مسیحی رفاقت پر نظر ڈالتے ہیں تو ہمارے تجربہ میں تین باتیں ایسی پائی جاتی ہیں جو یہ جاننے میں ہماری مدد کر سکتی ہیں کہ مسیح کون ہے ؟

پہلی بات ۔ مسیحی دُعا کا تجربہ :۔

عمُوماً مسیحی اپنے خُداوند یسُوع مسیح کے وسیلہ سے خُدا باپ سے دُعا مانگتے ہیں ۔ لیکن شروع ہی سے قدرتی طور پر وہ براہِ راست مسیح سے بھی دُعا مانگتے رہتے ہیں ۔ کلیسیا کی سب سے پرانی دُعاؤں میں سے ایک یہ ہے ”خُداوند ہم پر رحم کر ۔ مسیح ہم پر رحم کر ۔ خُداوند ہم پر رحم کر“ لیکن کیا اس دُعا کے کچھ معنی ہو سکتے ہیں جب تک کہ ہم دُعا میں ایک ایسے شخص سے گفتگو نہ کریں جو خُود خُدا ہو اور دُعا سُن سکتا ہو اور جواب دے سکتا ہو ۔

دُوسری بات ۔ مسیحی عبادت کا تجربہ :۔

اکثر اوقات کلیسیا کی عبادت خُشک اور بے جان سی ہوتی ہے ۔

لیکن جب کبھی ہماری عبادت حقیقی ہوتی ہے تو ہم جانتے ہیں اور محسوس کرتے ہیں کہ زندہ مسیح ہمارے درمیان موجود ہے۔ اور خاصکر پاک عشاء کی رسم میں یہ تجربہ سچا ثابت ہوتا ہے۔ مسیحیوں میں پاک عشا میں حضور مسیح کی موجودگی کے موضوع پر افسوسناک اختلافات اور جھگڑے ہوتے رہے ہیں۔ لیکن کیا مسیحیوں کا کوئی بھی فرقہ خداوند کی میز پر ایک غیر حاضر دوست کو یاد کرنے کے لئے جمع ہوتا ہے؟ کیا وہ ایک حاضر و ناظر دوست کے خیر مقدم کے لئے خوشی سے جمع نہیں ہوتے تاکہ اُن میں یہ دُعا پوری ہو کہ " ایمان کے وسیلہ سے مسیح تمہارے دلوں میں سکونت کرے (افسی ۳ : ۱۷) لیکن یہ کون ہے جو آکر بہت سے دلوں میں سکونت کر سکتا ہے۔ اور اپنے آپ کو شخصی طور سے ہر ایماندار پر ظاہر کر سکتا ہے؟

تیسری بات مسیحی رفاقت کا تجربہ:-

کلیسیا میں یہ تجربہ بھی جسقدر ہونا چاہیئے اُس سے بہت کم پایا جاتا ہے۔ لیکن رفاقت کا یہ تجربہ کلیسیا میں پایا ضرور جاتا ہے۔ کلیسیا ایک بین الاقوامی مجلس ہے۔ اِس میں تقریباً تمام اقوام اور طبقوں کے لوگ شامل ہیں اور باہم متفق ہیں۔ لیکن وہ کون ہے جو یہودیوں اور بت پرستوں، کالوں اور گوروں، اُونچی اور نیچی ذات والوں، امیروں وغریبوں کے درمیان سے قدرتی حد بندیوں کو توڑ سکتا ہے؟ کلیسیا ایک ہے کیونکہ یہ مسیح کا بدن ہے لیکن یہ مسیح کون ہے جو اپنے بدن کو ایسی یکتائی دے سکتا ہے؟

ہم دُوسروں کے لئے اور اپنے لئے تمام دلائل استعمال کرنے کے بعد

بھی محسوس کرتے ہیں کہ ہم نے بہت سے مسائل بلا حل چھوڑ دیئے ہیں۔ اور اگر مسیح پھر ہمارے پاس آئے اور ہم سے اپنا سوال پُوچھے "تُم مجھے کیا کہتے ہو؟" تو ہم نہیں جانتے کہ ہم جواب میں کیا کہیں گے۔

اگر ہماری یہی حالت ہے تو شاید ہمارے لئے بہترین بات یہی ہے کہ ہم صرف یہ کہیں کہ مسیح کی ذات پاک میں ہم خُدا کی انسانی زندگی دیکھتے ہیں۔ خُدا چاہتا تھا کہ انسان کی زندگی بسر کرے۔ اُس نے باطنی تجربہ کرنا چاہا کہ انسان ہونا کیا معنی رکھتا ہے۔ اس لئے خُدا آیا، اور اگر خُدا کی مرضی یہی تھی تو اُسے کونسی چیز روک سکتی تھی؟ لیکن چُونکہ ایسا نہ تو کبھی پہلے ہُوا تھا اور نہ کبھی ہُوا ہے۔ اِس لئے سر عدیم المثال چیز کی مانند اُس کا یُوں آنا ہمارے لئے عجیب اور پُر راز ہے لیکن اگر کسی صُورت سے ہم خُدا کو انسانی زندگی گزارتے تصور کر سکیں تو کیا جو تصویر انجیل میں پیش کی گئی ہے اُس میں ہم کوئی تبدیلی کرنا چاہیں گے؟ یقیناً ہم کبھی یہ اندازہ بھی نہیں کر سکتے تھے کہ حلیمی میں قدرت چھپی ہوگی اور خُدا دُنیا میں غریبوں کا دوست بن کر اِدھر اُدھر پھرے گا۔ اور ہم کبھی اندازہ نہیں کر سکتے تھے کہ خُدا ہمیں اتنا پیار کرے گا کہ ہماری خاطر اپنی جان دے دیگا۔ لیکن اگر ہم دیکھتے ہیں کہ یہ ایسا ہی ہُوا یا اِس جیسا کچھ ہُوا تو کیا یہ چیز دُنیا کی ہر مشکل کو حل نہیں کرتی؟ زندگی کی ہر شے ہم پر اپنے صحیح معنوں میں نظر آنے لگتی ہے مثلاً زندگی کے آلام اور شان و شوکت، زندگی میں پاکیزگی کی خواہش اور حصُولِ پاکیزگی میں ناکامی پر ہم اس بات کو ذہن نشین کر لیتے ہیں کہ خُدا ہمیں پیار کرتا ہے۔ اور ہمارے گناہ کے لئے اُس کی محبت کو کیا قیمت ادا کرنا پڑی۔ ہمیں یقین دلایا جاتا ہے کہ خُدا ہمیں کبھی نہیں چھوڑے گا اور بالآخر وہ ہمیں اپنے پاس ہمارے اصلی وطن میں لیجائیگا۔

مسیح یہ سب کچھ کرنے کے لئے آیا۔ اگر یہ سچ ہے تو ہمیں معلوم ہوگا کہ ہم توما کے ساتھ یہ کہنے سے باز نہیں رہ سکتے "میرے خداوند اور میرے خدا" (یوحنا ۲۰ : ۲۸) یہاں ہمارے ایمان کے دونو پہلوؤں کا خلاصہ ایک بہت پرانی مسیحی دعا کے الفاظ میں یوں ہوگا:۔

"تو جو جہان کے گناہوں کو اٹھا لے جاتا ہے ہماری
دعا قبول کر۔ تو جو خدا باپ کے دہنے ہاتھ بیٹھا ہے
ہم پر رحم کر۔ کیونکہ تو ہی قدوس ہے۔ تو ہی خداوند
ہے۔ اے مسیح تو ہی روح القدس کے ساتھ خدا
باپ کے جلال میں اعلیٰ ہے۔ آمین"

پی - آر - بی - آئیس پریس لاہور میں

باہتمام

مسٹر وی - ایس - کے فضل سیکرٹری

پنجاب ریلجیس بک سوسائٹی - انارکلی لاہور چھپکر شائع ہوئی -